دسمبر Dec. 2021

www.shibliinternational.com

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی

قیمت : -/20 روپے

Issue:46 شمارہ_Vol4 جلد

دسمبر: Dec :2021

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہہ میری پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مفتی محمد فاروق قاسمی مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، مولانا عبدالوحید ندوی، مولانا احمد نور عینی، ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20 سالانہ: 220
رجسٹرڈ ڈاک: 350- بیرونی ممالک: 50 امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 2000

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	نجات کا اٹل قانون	مولانا حبیب الرحمٰن	۷
۴	سوشل میڈیا اور اسلام	امانت علی قاسمی	۱۰
۵	مولانا آزاد کا تصورِ مستحکم و متحدہ قومیت	محمد قاسم	۱۴
۶	حیدرآباد کا ادبی وصحافتی پس منظر	سعیدہ رخسانہ بیگم	۱۹
۷	پروفیسر محمد انور الدین بہ حیثیت تحقیق نگار	فاطمہ اختر	۲۲
۸	ٹیپو سلطان اور نپولین	شیخ محمد سراج الدین	۲۷
۹	دُعا	یاور حبیب ڈار	۲۹
۱۰	اردو ادب اور شاعری	آیئنہ اختر	۳۰
۱۱	غزل	جہانگیر قیاس	۳۳
۱۲	صحافت کے اصول وصحافتی اخلاقیات	عبدالحفیظ رحمانی	۳۴
۱۳	غزل	حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ	۳۶
۱۴	انشائیہ اور مقالہ	وسیم بیگم	۳۷
۱۵	اعلامیہ	ادارہ	۴۲

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی... جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد
مفتی **محمد فاروق قاسمی**۔ صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد... مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ
الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ
حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ) مقیم حال دبئی... ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چار مینار، حیدرآباد
مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد... الحاج **محمد قمر الدین**، نبیل
کالونی بارکس حیدرآباد... الحاج **محمد عبدالکریم**۔ صدر مسجد اشرف کریم گلشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

گذشتہ انتیس سال سے جب بھی ماہِ دسمبر آتا ہے تو چھ دسمبر ۱۹۹۲ء کا وہ دردناک منظر سامنے آجاتا ہے۔ کیونکہ اس یوم سیاہ کو ریاست اتر پردیش میں بھارتی جنتا پارٹی کی حکومت میں جس کا وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ اور مرکز میں کانگریس پارٹی کی حکومت میں، جس کا وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ تھا۔ ساڑھے چار سو سالہ قدیم بابری مسجد کو آر ایس ایس اور دیگر ہندو تنظیموں کے ذریعہ شہید کر دیا گیا، اس دن ہمارے ملک کے دستور کی دھجیاں اڑا دی گئی تھیں اور ہمارے ملک کی قومی یکجہتی پر ایسا وار کیا گیا کہ عین ممکن ہے قیامت تک اس ملک کے باشندگان کو برداشت کرنا پڑے۔ اس کے بعد تقریباً اٹھائیس سال تک مقدمہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں چلتا رہا مگر کیا کیا جائے کہ جب آدمی اور انصاف طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور دلائل وشواہد کے خلاف فیصلہ دیدے، تو اس سے شرمناک اور افسوسناک بات کیا ہوسکتی ہے؟ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ دلائل اور انصاف ہی کے ذریعہ ثابت قدم رہا جاسکتا ہے، جس سے ملک اور سماج کو فائدہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو حالات پلٹنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ کیونکہ یہ دن ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں امت مسلمہ پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس ملک کے تانے بانے کی حفاظت کے لیے تیار ہو جائیں اور اپنے داخلی نظام یعنی اپنی مسجدوں کو نمازوں، تعلیم، سوشل اور سماجی کاموں کے ذریعہ آباد رکھیں۔

موجودہ حکومت بقول ان کے کسانوں کے حق میں، ہم تین قانون لائے تھے اور کسان ان تینوں قانون کو کالا قانون کہہ رہے ہیں، آناً فاناً میں لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں اپنی اکثریت کی بنیاد پر بل پاس کرالیا۔ کسانوں نے احتجاج شروع کیا، گرمی، سردی، بارش سبھی موسموں میں احتجاج کو پورے یقین کے ساتھ جاری رکھا، تقریباً آٹھ سو کسانوں نے اپنی جانوں کو نچھاور کردیا۔ پورے ایک سال کے بعد ملک کے وزیر اعظم نے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر آکر کہا کہ ہم تینوں قانون کو واپس لیتے ہیں اور ہم اپنے کسان بھائیوں کو اس قانون کی افادیت نہیں سمجھا سکے۔ قانون بننا، واپس لینا یہ دنیا کا دستور ہے مگر جب غلط طریقہ اور انا کا مسئلہ آجائے تو یہ خطرناک بن جاتا ہے۔

تلنگانہ ریاست میں پچھلے چند سالوں میں چند مساجد کی شہادت کا معاملہ آیا، اس میں سکریٹریٹ کی دو مسجدوں کا بھی مسئلہ آیا۔ موجودہ ٹی آر ایس حکومت میں مسجدیں شہید ہوئیں حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ریاست تلنگانہ کے غیور مسلمانوں نے کافی شدت سے احتجاج کیا، جس کا نتیجہ ماشاء اللہ منشا کے مطابق آیا۔ حکومت تلنگانہ نے علماء، دانشور اور سیاسی ممبران کے ہاتھوں ان دو مساجد کی بنیاد رکھ دی ہے اور تعمیری کام جاری ہے۔ ادارہ حکومت ٹی آر ایس، مجلس اتحاد المسلمین اور تمام کوشش کرنے والوں کو سلام پیش کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کی ۳۲۷ گز اراضی پر مدرسہ، مصلّیٰ، ریسرچ سینٹر کے لیے تعمیری کام جاری ہے۔ پہلا چھت الحمدللہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پڑچکا ہے۔ ادارہ تعمیری کام میں حصہ لینے کی گزارش کرتا ہے۔ جزاک اللہ احسن الجزاء۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ انہوں نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپؐ زنانہ میں تشریف لے جا چکے تھے کہا آواز دو انہوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کو آواز دوں، مخرمہؓ نے کہا بیٹے! محمد ﷺ جبار نہیں ہیں، ان کی جرأت دلانے سے مسور نے آواز دی، آنحضرت ﷺ فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں۔

ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس خدا کی قسم جس نے موسیٰؑ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ پر تعریض ہے، غصہ میں آکر اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت ﷺ کے پاس فریادی آیا، آپؐ نے انصاری کو بلا بھیجا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ "مجھ کو انبیا پر فضیلت نہ دو"۔

(انسان کے غرور وترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے، جب وہ اپنے چپ وراست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے، جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کردینے کو تیار ہوجاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرار و پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے تواضع وخاکساری کا منظر اس وقت اور نمایاں ہوجاتا ہے، فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سرِ مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آکر مل گیا۔ غزوۂ خیبر میں جب آپؐ کا داخلہ ہوا تو آپؐ ایک گدھے پر سوار تھے، جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی، حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپؐ سوار تھے، سن چکے ہو کہ اس کی قیمت کیا تھی۔)

تعظیم اور مدحِ مفرط سے روکتے تھے: (شرک کا پہلا دیباچہ انبیا اور صلحا کی مبالغہ آمیز تعظیم ہے، آنحضرت ﷺ اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کی مثال پیش نظر تھی، فرمایا کرتے تھے کہ "میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریمؑ کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔

قیس بن سعد کہتے ہیں ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیسِ شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گذروگے تو سجدہ کروگے؟ کہا نہیں فرمایا تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہئے۔

معوذ بن عفرا کی صاحب زادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپؐ ان کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا، اس پر بیٹھ گئے، گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہوگئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں، گاتے گاتے ایک نے یہ مصرع لگایا:

فینا نبیّ یعلم مافی غد

ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے

فرمایا "یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں"۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۲۶۶/۲۶۸)

مولانا حبیب الرحمن۔حیدرآباد

نجات کا اٹل قانون

پاکستان میں عیدالفطر، عیدالاضحیٰ سے کہیں زیادہ جوش وخروش کے ساتھ عید میلاد، عیدالعیاد (عیدوں کی عید) کے نام سے منائی جاتی ہے۔ زرکثیر تعمیری مقاصد میں خرچ کرنے کے بجائے دین کو بگاڑنے میں خرچ کیا جارہا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان تخریبی اُمور کی انجام دہی کے لیے چندوں کی اپیل کی جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو ان ہی پیسوں سے گمراہ کیا جارہا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے لیے رسول تھے ان کے ماننے والے تو زمین کے چپے چپے میں ہر طریقے سے عیسائیت کا پرچار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور قرآن کو آخری کتاب اور محمدؐ کو آخری رسول اور رحمۃ للعالمین ماننے والے صلاۃ التسبیح ومعکوس، صلوۃ غوثیہ، ختمِ قرآن وبخاری، ختمِ خواجگان، کلمہ طیبہ کے ختم آیتِ کریمہ کے دسترخوان بچھانے، برکت کے رات ودن منانے، درود وسلام کے پڑھنے، ماتم ومرثیہ خوانی، زیارت، دسواں، چہلم، برسی کے ذریعہ ایصال ثواب کرنے اور قوالی کے ذریعہ تعلق باللہ پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ بارہویں، گیارہویں اور کنڈوں کے ذریعہ خیروبرکت وثواب حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ

ملحوظ رہے کہ یہ طریقے اگر حصول ثواب کے لیے اختیار کیے جائیں تو قطعاً بدعت ہے اور اگر حصول برکت ونفع اور نقصان سے بچنے کے لیے کیے جائیں تو یہ شرک ہے۔ کیونکہ نفع ونقصان اللہ کے مقررہ قانون کے تحت ہوتا ہے۔ ان تقاریب میں کھانے، پینے کی چیزیں تبرک نہیں بلکہ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ (البقرہ ۱۷۳، المائدہ ۳، الانعام ۱۴۵، النحل ۱۱۵) ہر وہ چیز جو غیراللہ کے نامزد کردی گئی ہو یا ان کے خوشنودی کے لیے کی گئی ہو، کی رُو سے حرام ہے۔

کافر

زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَيَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (البقرہ ۲۱۲) ''کافر کو دنیا کی زندگی بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے اور ابدی زندگی کی فکر کرتے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں''۔

یعنی کافر وہ ہے جو رات دن صرف اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس کی دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہے۔ چنانچہ یہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے جو آخرت کی ابدی زندگی کے نقصانات کے خوف سے ہر ناجائز طریقے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور آخرت کے ابدی نقصان سے بچنے کے لیے ہر ناجائز نفع کو ٹھکرا کر دنیا کے نقصان وتکلیف کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔

مومن

جو اپنی زندگی کے تمام اُمور میں آخرت کے

ابدی نقصان سے بچنے کی فکر وکوشش میں لگا رہتا ہے اور جب بھی کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو فوراً نادم ہوکر توبہ کرتے ہوئے اصلاحِ حال کی کوشش کرتا ہے۔

منافق

زبان سے کلمہ کا اقرار لیکن عمل کے وقت اللہ ورسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے۔ بالخصوص نفعِ دنیا کے لیے یا دنیا کے نقصان سے بچنے کے لیے نافرمانی کرتے ہوئے شرماتا بھی نہیں۔ اللہ ورسولؐ کے ان ہی احکام پر عمل کرتا ہے جس سے اس کے نفعِ دنیا پر کوئی آنچ نہ آتی ہو۔ جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، گالی گلوج، منافق کی خصلتیں ہیں۔ دنیا کے نقصانات یا تکلیف کو اپنی غلطی کا نتیجہ سمجھنے کی بجائے دوسروں کو اور اللہ تعالیٰ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

فساد

زندگی کے کسی بھی معاملے میں اللہ ورسولؐ کی نافرمانی کرنے والا فسادی ہے، مثلاً جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، اسمگلنگ، ناپ تول میں کمی بیشی کرنا، رشوت لینا ودینا، دوسروں کو اپنے کے مقابلے میں کمتر سمجھنا، حقوق ادا نہ کرنا، ریاکاری کرنا وغیرہ۔ فسادی، جنت سے محروم رہے گا۔

خیرِ امت بننے کے لیے امر بالمعروف نہی عن المنکر (اچھی بات کا حکم دینا اور بری بات سے منع کرنا) لازمی وضروری ہے۔ پہلا امر اَعْبُدُوا اللّٰہَ "اللہ کی بندگی کرو" پہلی نہی وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (النساء۳۶) "اللہ کے ساتھ کسی کو بھی کسی طرح بھی شریک نہ کرنا" صرف آخرت میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں بھی عذابِ الٰہی سے بچنے کے لیے امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنا ضروری ہے۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (المائدہ۷۹) "آپس میں ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے جو وہ کرتے تھے نہیں روکتے تھے" اس کے علاوہ سورہ الانفال ۲۵، الاعراف ۱۶۳ تا ۱۶۷ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ "تم میں سے جو منکر بات دیکھے پس اس کو چاہئے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، پس جو ایسا نہ کر سکے تو اس کو چاہئے کہ اپنی زبان سے اس کو بدل دے (اس سے منع کرے)، پس جو کوئی ایسا نہ کر سکے تو اس کو چاہئے کہ اس کو اپنے دل سے بدل سے (شرکت نہ کرے) اور یہی سب سے کمزور ایمان ہے (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: بری بات سے منع کرنا ایمان کی علامت ہے۔)

مسلم ہی کی ایک اور حدیث میں اس کو رائی کے دانہ برابر ایمان قرار دیا گیا ہے۔ کسی منکر بات کو دل سے برا سمجھنے والا اس منکر بات میں شریک نہیں ہوسکتا۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے سے اصلاح وتبلیغ کا کام بھی ہوجاتا ہے۔

قرآن کا بنیادی مقصد

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا (الفرقان) "بابرکت ہے وہ ذات جو اپنے بندہ پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام دنیا والوں کو خبردار کردے" وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام۱۹) "اور یہ قرآن میرے پاس وحی کے

ذریعہ بھیجا گیا ہے (اس لیے بھیجا گیا ہے) کہ میں اس قرآن کے ذریعہ تم کو خبردار کروں اور جس کو یہ قرآن پہنچے (اس کا بھی یہی کام ہے")

نیز ملاحظہ ہو سورہ الاعراف ۱۷۰، الفرقان ۵۲'۱۵۔ مسلمانوں کے عقائد واعمال میں جو فساد ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے کتاب وسنت اور اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں اصلاح کی دعوت دینا اور غیر مسلم حضرات کے سامنے ان کے اپنے مسلمات، سب کا خالق ورب ایک اور تمام انسانوں کی نسل واصل ایک اوران کی ضروریات وخواہشات ایک اس لیے سب کے لیے ایک ہی دین ہونے کی بات پیش کی جائے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے پر ابدی زندگی کا جو نقصان ہوگا اس کو پیش کیا جائے۔

جھوٹ

جھوٹ بولنے اور جھوٹی گواہی دینے کو شرک کے برابر گناہ قرار دیا ہے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج) "پس اے ایمان والو! بچو بتوں کو (پوجنے) کی گندگی سے (شرک کرنے سے) اور بچو جھوٹ بولنے سے" وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (الفرقان) "اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے"

اس کو عبادالرحمٰن کے صفات قرار دیا گیا ہے۔

وعدہ خلافی

ایک وعدہ خلافی پچھلے تمام نیک اعمال کو برباد کر دیتی ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (النحل ۹۲) "اور مت ہو جاؤ اس عورت کی طرح جو روئی سے تاگا بناتی ہے پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے" يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف) "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کو تم کرتے نہیں ہو"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک وعدہ خلافی کرنا اپنے تمام نیک اعمال کا باطل کر لینا ہے۔

ریاء

دکھاوے کے کام کرنے والے کے ایمان باللہ وایمان بالآخرت کی نفی کی گئی ہے۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ ۲۶۴) "اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرے، ایسا شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یوم آخر پر"۔

ذرا سا بھی دکھاوے کو شرک قرار دیا گیا ہے (مشکوٰۃ) دکھاوے کے لیے قیام، رکوع، سجود، دعا کو چند لمحوں کے لیے طول دینا بھی ریاء ہے جو شرک ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا انسان کے فطری تقاضے ہیں، ان مطالبات کی تکمیل لوگوں کو دکھانے کے لیے یا مقابلہ کے لیے نہ کی جائے، ورنہ ایسا کرنے والے اللہ کے پاس ریا کا قرار پائیں گے، جس سے ان کی تمام نیک اعمال باطل ہو جائیں گے۔

امانت علی قاسمی۔استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

سوشل میڈیا اور اسلام

اسلام ایک عالمی و آفاقی دین ہے جس میں زندگی کے ہر نئے چیلنجوں کو قبول کرنے کی بھر پور صلاحیت ہے۔ اسلام کی بنیادی ذمہ داریوں میں تبلیغ ہے۔ حدیث میں ہے بلغوا عنی ولو آیة آج کا دور انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا دور ہے۔ اس وقت اسلام دشمن طاقتیں، اسلام مخالف پروپیگنڈوں کے لیے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا بھر پور استعمال کررہی ہیں، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی انٹرنیٹ سے جڑا ہوا ہے اور اپنی دینی معلومات کے لیے گوگل اور یوٹیوب کو امہات الکتب شمار کررہا ہے اور اس پر موجود مواد کو ہی صحیح دین کا مصدر ومرجع سمجھ رہا ہے، مستشرقین اور یہودیوں کے گہرے تعلقات انٹرنیٹ، بلاگس اور سوشل میڈیا سے شروع ہی سے رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ وہ اسلام و مسلمانوں کے خلاف پوری دنیا میں طرح طرح کی افواہیں، پروپیگنڈے پھیلاتے ہیں اور تعلیمات اسلامی کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا استعمال اپنے مفادات کے لیے کرتے ہیں اور اس دائرہ کار میں اضافہ کے لیے کثرت سے لوگوں کو جوڑتے ہیں۔ اس کے برے نتائج اس وقت برآمد ہوتے ہیں جب نسل نو کے معصوم صارفین اسلام سے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں تو یہودیوں و مستشرقین کے سلجھے اور لچھے دار اسلوب و انداز سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اسی کو حقیقی اسلام تصور کرنے لگتے ہیں اور اپنی زندگی کو انہی کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ ان کا معصوم ذہن اس چیز کا ادراک کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ حاصل شدہ مواد و مضامین اور افکار و خیالات خام اور تعلیمات اسلامی کے بالکل منافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نسل نو کے نوخیز نوجوانان فکری وعقلی انحراف کے زیادہ شکار ہیں اور ان کے ذریعہ سے وہ ان جماعتوں میں بھی اپنی گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں جن کی دین اسلام سخت نکیر کرتا ہے۔ یہودیوں اور دیگر اسلام دشمن طاقتوں کے ساتھ اس میدان میں قادیانی بھی بہت آگے ہیں انہوں نے اسلامی نام سے بہت سی ویب سائٹ بنائے ہیں جس کے بارے میں عام مسلمانوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ اسلامی سائٹس ہیں، جن سے استفادہ کرنا چاہیے جب کہ حقیقت میں وہ گمراہی کا مخزن اور تحریفات کی آماجگاہ ہوتے ہیں جن سے استفادہ کرکے یا متاثر ہوکر ہمارے بہت سے سادہ لوح مسلمان اسلامی عقائد وتعلیمات سے بہت دور ہوجاتے ہیں اور بسا اوقات اپنے ایمانی جسم پر کفر کا لباس زیب تن کر لیتے ہیں اس سے واقف ہونا اور عام مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی فکر وکوشش کرنا یہ ہمارا ایمانی فریضہ اور شرعی ذمہ داری ہے۔

بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم تحریری طور پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں اور ہر طرح کا مسکت جواب دیتے ہیں جب کہ آج لوگ پڑھنے سے بیزار ہوکر موبائل اور انٹرنیٹ پر آگئے ہیں، وڈیو دیکھ کر اطمنان کر لیتے ہیں؛ بلکہ وڈیو پروگرام کی لت ان پر اس قدر مسلط ہوگئی ہے کہ وہ ہر

مرض کا علاج یوٹیوب کے میڈیکل میں تلاش کرتے ہیں اور ہر درد کی دوا گوگل کے سرچ ہاسپٹل میں ڈھونڈتے ہیں، کتابوں سے بیزاری کے ساتھ یہ نشہ اس قدر حاوی ہو گیا ہے کہ وہ انٹرنیٹ کی دنیا کو ہی اپنا مے خانہ، گوگل کو جام وسبو اور یوٹیوب کو ساغرو مینا تصور کیے ہوئے ہیں، یوٹیوب کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ بغیر یوٹیوب پر کچھ دیکھے ان کو نیند نہیں آتی ہے گویا کہ یوٹیوب موجودہ نسل کی نیند کی گولی ہے جسے سونے سے قبل وہ ضرور لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری تحریریں جو صحیح اسلام کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہیں وہ لوگوں کی دسترس سے دور رہ جاتی ہیں اور باطل افکار و خیالات کے حامل لوگوں کی طرف سے بنائی گئی وڈیوز لوگوں کی زندگی اور ان کے اعمال پر اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ یہ کوئی ایک دو واقعہ نہیں ہے؛ بلکہ سوشل میڈیا پر رہنے والا ہر شخص اس صورت حال سے واقف ہے۔ ابھی کورونا کے دور میں خود میں نے بہت سے مسائل پر تحریریں لکھیں اور ہمارے پاس اسی مسئلہ سے متعلق بعض وڈیوز آئے کہ اس میں جو کہا گیا ہے وہ درست ہے یا نہیں؟ جب کہ میری وہ تحریر بھی ان کے پاس موجود ہے؛ لیکن میری تحریر ان کے استفادے کے قابل نہیں ہے؛ اسی لیے وہ وڈیو دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اس وڈیو پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

انٹرنیٹ پر بہت سے لوگ اپنے آپ کو اسلام کا ترجمان باور کرا کر موجودہ آلات سے لیس ہو کر اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں دارالافتا میں اس طرح کے سوالات آئے دن آتے رہتے ہیں کہ ہمیں فلاں صاحب کی بات بہت اچھی لگتی ہے ہم ان کا بیان سن سکتے ہیں یا نہیں؟ ہم چوں کہ انٹرنیٹ سے دور ہیں اور مذکورہ بیان سے ناواقف ہیں اس لیے کوئی صحیح جواب دینے سے قاصر ہوتے ہیں اور یہ لکھ دیتے ہیں کہ ہمیں ان کے بارے میں معلومات نہیں ہیں؛ لیکن ارباب تحقیق جانتے ہیں کہ یہ سوال کا جواب نہیں ہے اور نہ ہی ہم اس طرح کے جواب سے اسلام کی صحیح ترجمانی کر پاتے ہیں؛ اس لیے آج ضرورت ہے کہ اسلام کے آفاقی پیغام کو آفاق تک پہونچانے کے لیے موجودہ زمانے کے آلات استعمال کیے جائیں اور لوگوں سے ان کی زبان میں بات کی جائے ان کے اسلوب اور مانوس طریقہ میں گفتگو کی جائے۔

اسلام ایک داعی مذہب ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ لوگوں سے ان کی متعارف و مانوس زبان میں گفتگو کی جائے، انٹرنیٹ کا ایک مثبت پہلو اور مفید استعمال یہ ہو سکتا ہے کہ بحیثیت داعی قوم کے پوری دنیا کو دعوت کا میدان بنایا جائے اور انٹرنیٹ کے وسیع پنڈال کے ذریعہ معمولی خرچ کے ساتھ پوری دنیا کے لوگوں تک دین کی دعوت پہونچائی جائے، اور اسلام کے عالمی دعوتی مشن کے لیے انٹرنیٹ کے اسی فارمیٹ کو استعمال کیا جائے جس کے لوگ زیادہ دیوانے ہیں۔

ہندوستان میں اسلاموفوبیا کا مرض بھی بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے، اسلام کے تعلق سے برادران وطن کے دل میں خوف وہراس پیدا کر کے ان کے اندر مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا کرنا اسلاموفوبیا ہے۔ یہ مرض یورپ سے شروع ہوا اور اب ہندوستان میں اس کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں، آئے دن ہم نفرت اور پر تشدد واقعات اور ماب لنچنگ دیکھتے ہیں یہ سب اسلاموفوبیا کا حصہ ہے اس پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی حقیقی تصویر سامنے لائی جائے، اسلام کا پیغام امن و اخوت، مساوات، انسانی ہمدردی، انسانی حقوق کی پاسداری اور اسلام کے نظام عدل و انصاف کی بالادستی کو

لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

اس سلسلے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ وڈیو گرافی ہے۔ حضرات اہل علم تحریروں کے ذریعہ سے انٹرنیٹ پر اسلامی مواد شیئر کر رہے ہیں؛ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا ہے اسی طرح آڈیو پیغامات کا بھی ایک سلسلہ ہے جس سے بہر حال بہت سے لوگ جڑ رہے ہیں لیکن جس درجہ کی ضرورت ہے اس کی تکمیل نہیں ہو رہی ہے اس لیے کہ اس وقت لوگ وڈیو دیکھنے اور سننے کے عادی ہو چکے ہیں اس کے بغیر سوشل میڈیا پر اسلام کے تئیں منفی رویوں کا مسکت جواب نہیں دیا جاسکتا ہے ہماری تحریریں ان حلقوں اور ذہنوں تک نہیں پہونچ پاتی ہیں جن کے ذہنوں کو پراگندہ کیا گیا ہے۔

ضروری ہے کہ تصویر پر بھی مختصر گفتگو کی جائے، تصویر کی جو ممانعت اور سخت وعید قرآن وحدیث میں ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں ہے اور موبائل یا انٹرنیٹ پر جو تصاویر آتی ہیں وہ تصاویر محرمہ کے دائرے میں ہے یا نہیں؟ یہ ایک مختلف فیہ بحث ہے۔ ہندوستان کے ارباب افتاء کی بڑی جماعت کی رائے یہی ہے کہ ڈیجیٹل تصاویر بھی تصاویر محرمہ کے دائرے میں آتی ہیں؛ لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال جڑا ہوا ہے کہ اسلام کی تبلیغ واشاعت، اسلام پر ہونے والے منفی تبصرے، اسلام کے تعلق سے کیے جانے والے بے جا اعتراضات کے جوابات، صحیح اسلامی تعلیمات کی اشاعت، غلط افکار ونظریات اور غلط مسائل کے مقابلے میں صحیح افکار و نظریات کو پیش کرنے کے لیے انٹرنیٹ اور وڈیو کا استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند کے ادارہ مباحث فقہیہ: اسی طرح فقہ اکیڈمی انڈیا کی تجاویز ہے کہ ان مقاصد کے لیے انٹرنیٹ اور وڈیو پروگراموں کا استعمال جائز ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بارہویں سیمینار کی تجاویز ملاحظہ کریں۔

(1) اسلام کی نشر واشاعت اور اس کی حفاظت و بقا کے لیے ہر ممکن جدو جہد وسعی امت مسلمہ کا اہم فریضہ ہے۔

(2) **و اعدو لهم ما استطعتم من قوة** کے مطابق اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے جدید وقدیم ہر ممکن جائز ذریعہ و وسیلہ کا استعمال کرنا درست ہے بلکہ ضرورت و حالات کے مطابق مفید ومؤثر وسیلہ استعمال کرنا ضروری ہے۔

(3) بنیادی طور پر انٹرنیٹ آج کے زمانے کا سب سے اہم ذریعہ ابلاغ ہے اس کی حیثیت اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایک ذریعہ اور وسیلہ کی ہے اور ذرائع کا حکم شرعی متعین کرتے وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ ان ذرائع کا استعمال کن مقاصد کے لیے ہو رہا ہے ذرائع و وسائل کا استعمال جائز مقاصد کے لیے شرعا جائز اور ناجائز مقاصد کے لیے ناجائز ہے، پھر ان کا شرعی حکم اس طرح متعین ہوگا کہ ان مقاصد کا حصول فرض وواجب ہے یا مستحب ہے یا مباح ہے اور ان وسائل کا استعمال مکمل طور پر ان مقاصد کے حصول کے لیے جس حد تک ضروری ہو اسی کے بقدر ان وسائل کا استعمال فرض یا مستحب یا جائز ہوگا۔ ان اصولوں کی روشنی میں شرکاء سیمینار کی رائے ہے کہ انٹرنیٹ کا استعمال ایک شرعی، دینی، دعوتی، اجتماعی فلاح کے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت سے جائز اور بعض دفعہ ضروری بھی، تاہم ضروری ہے کہ عرض اور پیشکش کے طریقے میں منکرات اور محرمات شرعیہ سے بچا جائے۔

(4) ایک اہم سوال ان چینلس کے حکم شرعی کا ہے جو خالص دینی ودعوتی مقاصد کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور قائم کیے جا رہے ہیں اور ہر طرح کی فحاشی،، عریانی سے

پاک اور خالی ہیں۔ کیا ایسے چینلس کا قائم کرنا اور ان سے استفادہ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ تمام شرکاء سیمینار اس کو جائز قرار دیتے ہیں جب کہ بعض حضرات ان حالات میں بھی اجازت نہیں دیتے ہیں (ان میں چھ حضرات کے نام ہیں) (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص 303)

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے تیسویں فقہی سیمینار ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' میں منعقدہ ۳-۴ر اکتوبر ۲۰۲۱ء کی تجویز ہے۔

1 سوشل میڈیا موجودہ دور کی ایک اہم ایجاد ہے، جس سے منافع اور مفاسد دونوں وابستہ ہیں اور اس وقت یہ ابلاغ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

2 اسلام کی اشاعت، دینی معلومات کی فراہمی، اخلاقی تعلیمات اور جائز معاشی فوائد وغیرہ کے لیے سوشل میڈیا کا استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے؛ لہٰذا اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

3 اگر آڈیو یا ویڈیو کے مشتملات شرعی اعتبار سے درست ہوں تو ان کو سننے، دیکھنے اور دوسرے شخص کو بھیجنے پر کمپنی جو پیسہ دیتی ہے، اس کا لینا جائز ہے۔

4 ویڈیو کی نشر واشاعت کے لئے ناجائز یا غیر مصدّقہ اشتہارات کو اختیاری طور پر شامل کرنا درست نہیں ہے۔

5 سوشل میڈیا کے استعمال میں شرعی و اخلاقی اُمور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور جو اُمور غیر شرعی اور غیر اخلاقی ہوں، ان سے اجتناب لازم ہوگا۔

6 سوشل میڈیا پر باطل اور گمراہ فرقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر بنائی گئیں بہت سی سائٹس موجود ہیں؛ لہٰذا شرکاء سیمینار کی نوجوان نسل سے اپیل ہے کہ وہ ایسی سائٹس کے استعمال سے اجتناب کریں اور اس سلسلہ میں اپنے معتمد علماء سے رُجوع کریں (تجاویز اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)۔

مباحث فقہیہ جمعیۃ علمائے ہند کے آٹھویں اجتماع کی تجویز ہے: اسلام میں بلا ضرورت شرعی تصویر کھنچوانا ناجائز ہے لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ پر اعدائے اسلام یا شر پسند فرقہ پرست طاقتوں کی طرف سے کوئی ایسی چیز سامنے آئے جس سے اسلام کی شبیہ بگڑنے یا مسلمانوں کے حقوق کے ناقابل تلافی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس کے دفاع کے لیے ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام پر آنے کی ضرورتاً گنجائش ہے (فقہی اجتماعات کے اہم فقہی فیصلے وتجاویز، ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند ص: 73)

تاہم حضرات علماء نے اس فتوی میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اس لیے کہ علی الاطلاق اجازت تصویر کشی اور وڈیو سازی کی قباحت وحرمت کو دلوں سے کم کردے گی اور اس کا بے جا استعمال اور غلط استعمال کثرت سے ہونے لگے گا جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ بھی ہے اس لیے حتی الامکان جائز ذرائع کو استعمال کیا جائے اور ضرورت کی وجہ سے جدید آلات واسباب کو اختیار کرتے ہوئے اسلام کی نشر واشاعت اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کی ہر ممکن جد وجہد وسعی کی جائے، اسلام کے خلاف جو منفی سوالات ہیں وہ جن ذرائع کے ساتھ استعمال ہورہے ہیں، انہی ذرائع کے ساتھ جواب دیا جائے۔ یہ قرآنی تعلیمات **واعدوا لھم ما استطعتم** کے تحت آتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اس کے مفید اور مضر پہلو پر تفصیلی گفتگو کی جائے اور اس کے نقصان سے بچتے ہوئے اس کے مثبت استعمال کو بروئے کار لایا جائے ایسا نہ ہو کہ ہمارے بیدار ہوتے ہوتے وقت نکل ہو چکا ہو۔

محمد قاسم۔ٹولی چوکی۔حیدرآباد

مولانا آزاد کا تصورِ مستحکم و متحدہ قومیت

متحدہ قومیت ایک ایسا تصور ہے، جو ہندوستانی قوم کی مختلف ثقافتوں، ذاتوں، برادریوں اور مسلک کے لوگوں پر مشتمل ہے۔یہ نظریہ سکھاتا ہے کہ ہندوستان میں مذہب کے ذریعہ قوم پرستی کی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔ ہندوستانی شہری اپنی مخصوص مذہبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے وہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے رکن ہیں۔متحدہ قومیت کا خیال ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل مختلف مذہبی عقائد کے لوگوں کے درمیان کسی دشمنی کا وجود نہیں تھا۔

امتِ مسلمہ کسی ایک خطہ اور علاقہ کے بجائے الٰہی قوانین سے نوعِ انسانی کو روشناس کرانے کے لئے عالمی سفیر کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ہر زمانے اور ہر علاقے کی اقوام سے اپنے تعلقات کو مستحکم و مظبوط بنانا اور اسے استمرار و دوام دینا اس کا دینی فریضہ ہے، خاص کر جہاں ربانی ہدایات کی تبلیغ و اشاعت کی زیادہ ضرورت ہو وہاں وہ مصائب و مشکلات کو برداشت کر کے مرافقت و معاونت کی روش اختیار کرنے کی پابند ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمانوں کی یہ ذمہ داری زیادہ ہی بڑھی ہوئی ہے،مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ظرف نگاہی سے اِس کو محسوس کر کے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار اس بھولے ہوئے سبق سے امت مسلمہ کو آگاہ کیا ہے۔

متحدہ قومیت، ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلہ میں مولانا نے جو تصورات و خیالات پیش کیے ہیں انہیں صرف مولانا کے زمانے ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے وقت کے اہم ترین مطالبات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔متحدہ قومیت ہندوستان کا مشترکہ ورثہ تھی۔ مولانا جس وقت ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر جلوہ گر ہوئے تھے اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ باہمی ربط و تعلق نہیں تھا جو انھیں ملک کی آزادی کی جدو جہد کے لیے تیار کر سکے لیکن ہندوستانی سیاست کے میدان میں اترتے ہی مولانا اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ایک خوشگوار اور متحدہ ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ تحریکِ خلافت اور تحریکِ موالات کے دوران ایک غیر معمولی قومی اتحاد کا مظاہرہ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر کیا تھا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی،علی برادران، مولانا آزاد اور دوسرے بہت سے نامور رہبرانِ قوم جمع ہو گئے تھے۔ان کے اتحاد سے انگریزی طاقت لرز گئی تھی لیکن پھر اس نے اپنی حکمت عملی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے سازش شروع کر دی اور کچھ ہی زمانے کے بعد وہ اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔جیسے جیسے آزادی کی جدوجہد تیز ہوتی گئی انگریز نے ہندوستانیوں کے باہمی اتفاق کو ختم کرنے کی کوشش میں بھی تیزی کر دی اور وہ ہندو مسلمان جو ابھی تک مشترکہ جدوجہد سے آزادی حاصل کرنے کے لیے انگریزی طاقت کے سامنے

صف آرا تھے طبقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ متحدہ ہندوستان کے بجائے ملک کی تقسیم کا نعرہ بلند ہونا شروع ہوگیا اور اس طرح دوقومی نظریہ وجود میں آیا۔ کانگریس کا نظریہ تھا کہ ہندو مسلمان اپنی ثقافت اور ہندوستانیت کے اعتبار سے ایک قوم ہیں۔اس لئے ہندوستان کو متحدرہ کر آزادی کی جدو جہد کرنی چاہئے اور لوگوں کو فرقوں میں نہیں بٹنا چاہئے۔ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ ہندو اور مسلمان اپنے کلچر، زبان اور معاشرت کے اعتبار سے دو مختلف قومیں ہیں اس لیے ملک کی تقسیم ضروری ہے۔ ادھر ہندوؤں کے احیاء پرست طبقوں کا ردعمل بھی مسلمانوں کے حق میں نہیں تھا۔ مولانا آزاد کا موقف تھا کہ ہندو مسلمان دونوں کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالیں اور آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک کنبے کی طرح اپنے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کریں۔

ایک طرف ایک (غیر مسلم قوم) انگریز سے ترکِ موالات ومحاربہ کی دعوت اور دوسری طرف ایک دوسری غیر مسلم قوم (ہندو) سے رفاقت ہی نہیں بلکہ امت کو اس پر اعتماد کی دعوت دی تو کچھ لوگوں کی طرف سے سورۂ ممتحنہ کی آیات يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوا لَا تَـتَّـخِذُوا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ اور إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّـذِيْـنَ قَـاتَـلُـوكُـمْ فِيْ الـدِّيْـنِ وَأَخْـرَجُـوكُـمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ کے پیش نظر اشکال کیا گیا، مولانا نے ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

"اگر ایک طرف اسلام کے فریقِ محارب کے مقابلے میں ترکِ موالات بتایا گیا تو دوسری طرف یہ حقیقت کھول دی کہ جن قوموں نے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، ان کے لئے اللہ کی وہ شریعت جو دنیا میں ایک عالم گیر برادری اور محبت کا سبق دے اور دنیا کو خدا کی محبت کا ایک گھرانا بنانے کے لئے آئی ہے، محال ہے کہ وہ ایک منٹ کے لئے حکم دے کہ مسلمان دنیا میں کسی قوم سے محبت اور عہدِ اتفاق نہ کریں"۔(خطبات آزاد ص۱۵)

مولانا نے اپنا موقف سورہ ممتحنہ کی ہی مذکورہ آیت سے یہ پیش کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم کوئی نیکی کا یا انصاف کا معاملہ کرو۔یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"

"یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں سے نہیں جنگ کرتے ہیں اور نہ انہیں کوئی تکلیف دیتے ہیں، ان سے اچھا برتاؤ اور نیکی کا سلوک، اللہ تعالی کو ہرگز ناپسند نہیں، بلکہ انصاف کا معاملہ کرنا تو ہر مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ واجب ہے"۔(توضیح القرآن جلد۳ ص ۱۷۱۸)

ہندوؤں سے رفاقت یہی نہیں کہ قرآنی ہدایات کے مطابق درست اور مستحسن ہے بلکہ اس رفاقت و دوستی کی عظمت واہمیت سے مسلمان کا عقیدہ جڑا ہوا ہے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"بہرحال ہندو مسلمان کے اتفاق کے سلسلہ میں آپ کے سامنے یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت، یکجہتی اور رفاقت کا ہاتھ اپنے ہم سایوں کی طرف بڑھایا ہے تو ان کا یہ عمل محض کوئی وقتی اور دفاعی نہیں ہے بلکہ ان کو یقین کرنا چاہئے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے بلکہ ان کے خدا نے اور قوانینِ شریعت نے کھلوایا

ہے، چوں کہ اس کی بنیاد شریعت پر ہے اس لئے عزیز من یہ سب کچھ آج ترک موالات کے سلسلہ میں نہیں بلکہ بیس سال پہلے بھی میرا یہی اعتقاد تھا''۔(خطبات آزاد ص ۲۵)

انگریزوں سے آزادی کے بعد ملک کا دستوری نظام جمہوری بننے والا تھا اور جمہوریت میں سروں کو گنا جاتا ہے اور زیادہ سروں کی بنیاد پر حکومت تشکیل پاتی ہے۔ چوں کہ اقلیت و اکثریت الفاظ کے مصداق میں مسلم اور ہندو کا تصور جوڑ دیا گیا ہے اس بنیاد پر انگریز مسلمانوں کو اکثریت (ہندوؤں) کا خوف دلاکر ہندو مسلم اتحاد ختم کرنا چاہتے تھے۔

ایک طرف اقلیت و اکثریت کا ہوا کھڑا کر کے انگریزوں نے غیر انصاف پسند، انتہائی قلیل اقلیت کو فرقہ وارانہ ٹکراؤ کا پلیٹ فارم فراہم کیا تو دوسری طرف مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے جمہوری ملک میں مظلوموں اور مسلمانوں کو اپنے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لئے باشندگانِ وطن کو ہمدردیاں بھی دلانے کی کوشش کی، جمہوری ملک میں مولانا کا یہ خیال اظہر من الشمس ہے۔ کسی بھی قوم پر جب ظلم ہوتا ہے تو اکثریت کی طرف سے اس ظلم اور نا انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند ہوتی ہے اور مدد بھی ملتی ہے. اس لئے اقلیت و اکثریت کا ٹکراؤ نہ کل تھا نہ آج ہے، البتہ ایک چھوٹی اقلیت ان اصطلاحی الفاظ کو دو قوموں کے درمیان اختلاف کے لئے استعمال کرتی رہی ہے۔ ایک طرف ہندو نام سے فسطائی جماعتیں وجود میں آئیں تو دوسری طرف مسلمانوں میں بھی ایسی جماعتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ''ہم اقلیت'' کی دہائی دے کر ملک اور ہم مذہب قوم کا بیڑہ غرق کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں طبقوں میں ایسے غیر انصاف پسند لوگ اقلیت میں ہیں۔

ملک کی اکثریت کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتی ہو، ظلم و نا انصافی کے خلاف ہے چوں کہ اکثریت انصاف پسند ہے اس لئے مسلمانوں کے دل میں اکثریت کی پر فریب اصطلاح کے نتیجہ میں جو ڈر اور خوف پیدا کیا گیا اس کو مولانا آزاد کے اسی یقین و اعتماد کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے جو فی الحال نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس رفاقت میں پہل کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے اور اگر غیروں کی طرف سے یا خود مسلمانوں میں کسی تنظیم کی طرف سے اکثریت کا ڈر دلاکر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف بستہ کیا گیا تو یہ دونوں لحاظ سے ہلاکت وخسارہ کی تمہید ہوگی۔ مولانا کہتے ہیں:

''دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کیلئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو''

جیسا کہ مسلم لیگ اور دوسری بعض مسلم تنظیموں نے اکثریت کا خوف دلاکر اقلیت یعنی مسلمانوں کو گمراہ کیا تھا، مسلمانوں کو آج یقیناً احساس ہو رہا ہوگا کہ مولانا کا قول بالکل درست تھا اور یہ اختلاف و تقسیم کا خاکہ شرعی و عقلی نقطۂ نظر سے بالکل غلط تھا، مولانا ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ایک قوم جو ریگستانِ عرب سے دیوارِ چین تک آباد ہے اس کو زمین کے کسی خاص ٹکڑے کا تغیر کیا فائدہ پہونچا سکتا ہے''۔(خطبات آزاد ص ۲۷)

مولانا آزاد کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کتنا محبوب اور عزیز رہا ہے، اس کا اندازہ مولانا کی اس تقریر سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں انھوں نے اختلافات کے ساتھ حاصل ہونے والی آزادی کو پرزور الفاظ میں مسترد کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے

اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہوجائے تو میں سوراج سے دستبردار ہوجاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا، کیوں کہ سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے"۔(خطباتِ آزاد ص۱۹۲۔۱۹۳)

اقلیت واکثریت یعنی مذہبی بنیاد پر ملک کی تقسیم کو مولانا بنیادی طور پر غلط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

"متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا"۔(خطباتِ آزاد ص۳۱۹)

اتحاد و یکجہتی کی اہمیت، عظمت اور مسلمہ افادیت کے پیش نظر اپنی ذات کے بارے میں فخریہ طور پر گویا ہیں کہ:

"میں ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں"۔(خطبات آزاد ص۲۸۰)

چند نمایاں قائدین کی رہبری و رہنمائی میں کچھ مسلمان مختلف مدارج اور جہتوں میں ہندوؤں سے علیحدگی اختیار کئے ہوئے تھے، مولانا نے مسلمانوں کو ان راستوں کو چھوڑ کر ہندو، مسلم اتحاد کی شاہ راہ پر لا کھڑا کیا، اپنی اس کاوش کے بارے میں کہتے ہیں:

"مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے علی گڑھ پالیسی مسلمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی، کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہوجائیں، مسلمانوں کے لئے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا"۔(خطبات آزاد ص۵۲)

مولانا آزاد، مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کسی بھی حال میں ہندوستان کی تقسیم کے حق میں نہیں تھے لیکن مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا گیا جس میں رفتہ رفتہ اس قدر شدت پیدا ہوئی کہ اس کے نعم البدل کے طور پر دوسری تجویز پیش کرنے کے باوجود مطالبہ زور پکڑتا گیا اور انجام کار یہ محسوس کرلیا گیا کہ مسلم لیگ جو پاکستان کی دعویدار ہے وہ کسی طرح بھی ملک کی تقسیم اور پاکستان کے اپنے مطالبے کے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تو تبادلۂ خیال اور باہمی افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی۔ کرپس مشن اور شملہ کانفرنس وغیرہ کا سلسلہ جاری ہوا، گاندھی جی اور مسٹر جناح کی ملاقاتوں کا اہتمام ہوا۔ مولانا آزاد نے لیگی مسلمانوں کو پاکستان کے قیام اور اس کے خطرناک نتائج سے مسلسل اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ آگاہ کیا۔ اس دوران انہیں اپنی قوم کی بری بھلی باتیں بھی سنی پڑیں۔ طعنہ کشی، بے عزتی اور یہاں تک کہ گالیاں برداشت کرنی پڑیں۔ علی گڑھ کے طلباء نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی۔ انھیں کالے جھنڈے دکھائے گئے، ان کے خلاف نعرے لگائے گئے اور کون سا ایسا حربہ تھا جو انھیں ذلیل کرنے کے لیے قوم نے استعمال نہیں کیا۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ مولانا آزاد کی خواہش یہی تھی کہ ملک کی تقسیم نہ ہو کیونکہ اس کی تقسیم ہندوستان کو کمزور کر دے گی۔ وہ آخری دم تک یہ لڑائی لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔ لیکن ملک میں عبوری حکومت کے ناخوشگوار نتائج دیکھ کر کانگریس نے فیصلہ کر لیا کہ ملک کی تقسیم ہو جائے اور پاکستان کا مطالبہ مان لیا

جائے۔سردار پٹیل، پنڈت نہرو اور حد تو یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی تقسیم کو تسلیم کر لیا،لیکن پھر بھی مولانا آزاد اپنے موقف پر اڑے رہے اور اسے کبھی تسلیم نہیں کیا اور ہمیشہ وہ اس کے خلاف ہی رہے۔تقسیم سے پہلے گاندھی جی کے سوال پر کہ پاکستان کے سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کے جواب میں مولانا آزاد کہتے ہیں میں پاکستان کے خلاف ہوں اور اب بھی ہوں۔کبھی بھی مسئلہ پاکستان سے میری مخالفت اتنی زیادہ نہیں رہی جتنی آج ہے۔(ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت ص:۴۵۵)

لیکن چونکہ بٹوارہ ہندوستان کا مقدر تھا اس لیے وہ ہوگیا۔یہ مولانا کی زندگی کی سب سے منحوس گھڑی اور تاریک دن تھا۔وہ تاحیات اس صدمے سے دوچار رہے اور اخیر وقت تک کہتے رہے کہ ہندو اور مسلمان کو بانٹا جانا فطرتاً خلاف ہے۔لیکن اس تقسیم کے باوجود بھی مولانا متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے بارے میں سوچتے رہے اور ہمیشہ اس بات کے خواہاں رہے کہ لوگوں کو اب بھی اپنی معاشرت وتہذیب تقسیم نہیں کرنا چاہئے۔بلکہ اس کی حفاظت کرنا سب کا فریضہ ہے۔ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب میں تقسیم کو وہ پانی پر چھڑی مارنے،اس کے دو حصوں میں بٹ جانے اور پھر اس کی انفرادیت کے غائب ہو جانے سے تشبیہ دیتے ہیں۔اور لکھتے ہیں:

"پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے۔چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم بھی غائب ہو جاتی ہے"۔(مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے۔ص:۲۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قانون اسلامی کے لحاظ سے مولانا کا موقف بہت ہی مظبوط تھا،اس لئے ایک چھوٹی تعداد کے علاوہ کثیر تعداد میں مسلمانوں نے مولانا کی آواز پر لبیک کہا اور ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ دوستی ورفاقت کو قائم ودائم رکھنے کی کوشش کی اور اس رفاقت کیلئے عام ہندوؤں کی طرف سے تعاون بھی ملا۔

غرض یہ کہ مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے لیے جو راستہ متعین کیا تھا اس پر وہ پوری اولوالعزمی کے ساتھ تاحیات گامزن رہے،اس کی تشہیر وفروغ اور حفاظت واستواری کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل رہے اور اس سلسلے میں ہمیشہ بےخوف وخطر اپنے افکار ونظریات کو پیش کرتے رہے جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ تمام ہندوستانیوں کے لئے امن وآشتی ،فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔آج بھی ایک صالح اور روشن ذہن رکھنے والا اس بات کو محسوس کرتا ہے اور وہ اسے تسلیم کئے بغیر نہیں رہ پاتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی تصورات ونظریات میں ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کا تصور ونظریہ وہ ہے جسے تمام نظریوں پر فوقیت اور اولیت کا درجہ حاصل ہے۔کیونکہ اسی مشن کو کامیاب بنانے کے لئے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔اگر چہ وہ اس مشن میں خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوسکے اور انھیں مختلف مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن باوجود اس کے ان کا یہ ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کا تصور ونظریہ جنگ آزادی کی راہ میں روشن چراغ کا کام انجام دیتا رہا اور آئندہ بھی ملک کی حفاظت وسالمیت،امن وآشتی اور تعمیر وترقی کے لئے ملک کو اس کی ضرورت پڑتی رہے گی اور یہ نظریہ ملک کو مظبوط و مستحکم بنانے میں معاون ثابت ہوتا رہے گا۔

سعیدہ رخسانہ بیگم۔ایم۔اے۔بی ایڈ۔یوپی ٹی،پی ایچ ڈی (اردو) ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی

حیدرآباد کا ادبی وصحافتی پس منظر

حیدرآباد کے اردو اخباروں کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ جگہ جگہ کی مختلف خبریں شائع کرکے عوام کی دلچسپی اور ان کے معلومات میں اضافہ کیا جائے، بلکہ ان میں اصلاحِ حال کا شعور پیدا کیا جائے۔ان کے فکرورائے کی صحیح سمت میں رہنمائی کی جائے۔ انھیں اخباروں کی بدولت گھر گھر علم و دانش کے چراغ روشن ہوئے۔شعرو ادب کی محفلیں آراستہ کی گئیں۔

قومی تحریکیں ہوں کہ انفرادی کوششیں، سبھی ان اخبارات کے ذریعہ پھیلتی ہیں۔حیدرآباد کی ادبی، لسانی، معاشی، سماجی، تہذیبی، مذہبی زندگی کے لیل ونہار کے مطالعہ کے لئے ان اخباروں کا پڑھنا بے حد ضروری ہے۔ان کے حوالہ کے بغیر حیدرآباد کی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔حیدرآباد سے اخباروں کی اشاعت کا آغاز قاضی محمد قطب کے اخبار" آفتابِ دکن" سے ہوتا ہے۔یہ ۱۸۶۰ء میں نکلا۔مگر اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طب کے متعلق زیادہ مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔قاسم علی سجن لال صاحب نے اس کو حیدرآباد سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار قرار دیا ہے۔انھوں نے ایک جریدے کے اعلامیہ کا بھی ذکر کیا ہے جو زین العابدین شیرازی کی ادارت میں ۱۸۶۹ء میں جاری ہوا تھا۔یہ حیدرآباد کا اسٹیٹ گزٹ تھا۔پہلے فارسی میں شائع ہوا کرتا تھا پھر اردو میں شائع ہونے لگا۔

سید انوار الحق جعفری جو ایک عرصہ تک صحافت سے جڑے رہے، کے مطابق حیدرآباد کا پہلا اخبار" خورشیدِ دکن" تھا جو ۱۸۷۷ء میں شائع کیا گیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے روزنامے کے طور پر" ہزار داستان" کو اولیت حاصل ہے۔ یہ ۱۸۸۳ء میں سلطان محمد عاقل دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا۔اخبار" شوکت الاسلام" ایک ہفت روزہ تھا۔یہ پہلے مدراس سے شائع ہوا کرتا تھا، پھر ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰ھ) میں حیدرآباد منتقل ہوا۔

آفتاب دکن، خورشید دکن، ہزار داستان کے بعد متعدد اخباروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ ان اخباروں میں پبلک آصفی، سفیرِ دکن، افسر الاخبار، اخبارِ آصفی اہم اخبار تھے۔" پبلک آصفی" ہوش بلگرامی نے ۱۸۸۳ء میں جاری کیا۔اس اخبار کو دیڑھ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ منظور تھی۔"افسر الاخبار" نواب افسر جنگ نے جاری کیا تھا۔وہ ایک فوجی تھے، مگر علم وادب سے انھیں بڑا انس تھا۔یہ ۱۸۸۶ء میں جاری ہوا۔بعد میں انہوں نے ماہنامہ" افسر" نکالا۔ان سے نواب صاحب کے ادبی اور علمی ذوق کی نشان دہی ہوتی ہے۔

۱۸۹۲ء میں آنجہانی کشن راؤ نے" مشیر دکن" جاری کیا۔ یہ اخبار آج تک جاری ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں اس قدر دیرینہ سال اخبار کی موجودگی قابل تعریف ہے۔تاہم ان دنوں یہ کسمپرسی کا شکار ہے۔یہ اخبار ۲۲/اپریل ۱۸۹۲ء کو جاری ہوا۔ اس اخبار نے اعتدال

پسندی، سلامت روی اور صلح کل کی پالیسی اپنائی۔

دوسرا روزنامہ ''علم و عمل'' ۱۹۰۲ء میں صادق حسین نے جاری کیا۔ مشیر دکن کے بعد اردو صحافت ایک نئے دور میں قدم رکھ چکی تھی۔ چنانچہ علم و عمل کافی دلچسپی سے پڑھا جانے لگا۔ صادق حسین کے بعد محبّ حسین نے ۱۹۰۴ء میں اس کے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ملا عبدالباسط نے ۱۹۱۱ء میں ''معارف'' جاری کیا۔ اسی سال عبدالحی اور سید رضا شاہ نے ''عثمان گزٹ'' جاری کیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی اکبر علی نے روزنامہ ''صحیفہ'' جاری کیا۔ حیدرآباد کا ایک اور ممتاز اخبار ''رہبرِ دکن'' ہے جسے احمد محی الدین نے ۱۹۲۰ء میں جاری کیا تھا۔ بعد میں (۱۹۶۰ء) یہی اخبار ''رہنمائے دکن'' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اس نے مذہبی، سیاسی اور ادبی میدانوں میں اہم رول ادا کیا۔

۱۹۳۰ء میں سعد اللہ قادری نے ''سلطنت'' جاری کیا۔ اس اخبار نے بڑی حد تک سیاست سے دوری اختیار کی اور ادب و تحقیق کو زیادہ جگہ دی۔ حیدرآباد کے ممتاز محقق شمس اللہ قادری صاحب اس کے سرپرست تھے۔ اس اخبار میں فرمان اور کلام دونوں شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں قاضی عبدالغفار نے ''پیام'' جاری کیا۔ پیام کی اشاعت سے صحافتی زبان بھی معیاری اردو سے قریب ہو گئی۔ اس میں ادبی چاشنی بھی شامل ہوگئی۔ قاضی صاحب کے اداریئے بہت ہی بصیرت افروز ہوا کرتے تھے۔ جب قاضی صاحب ناظم اطلاعات ہو گئے تو انہوں نے اختر حسین کو ''پیام'' کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اختر حسین صاحب ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ ان کا ادبی شستہ ذوق اور سنجیدگی نے ''پیام'' کی روایت کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد کی۔

اخبار ''میزان'' جو غلام احمد کی ملکیت تھا، ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج تھے۔ اس اخبار نے علم، ادب اور صحافت کی ۱۹۴۸ء تک گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۷ء میں عظیم الدین محبت نے ''مستقبل'' جاری کیا۔ یہ جامعہ عثمانیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے تھے۔ اچھے افسانہ نگار اور باذوق شاعر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ہی ایک اور اخبار ''اقدام'' مرتضیٰ مجتہدی نے جاری کیا۔ اس میں سیاسی، ادبی، جنسی اور فلمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ادبی مضامین پر انعام کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ سلیمان اریب، نجمہ نکہت، برق موسوی، احمد علی، راج بہادر گوڑ اور مخدوم محی الدین اس کے قلمی معاونین رہے۔ مرتضیٰ مجتہدی کی بیگم نے ''انگارہ'' جاری کیا۔ اس میں اسلم، وہاب حیدر اور معین فاروقی شریک کار تھے۔ اس کے بند ہونے کے بعد معین فاروقی نے ''انگارے'' جاری کیا۔

ان اخبارات نے نہ صرف عوام میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا بلکہ زبان اور لہجہ بھی سنوارا۔ صحافتی زبان کا تعین ہوا۔ علمی، ادبی اور اصلاحی رجحان بھی پیدا ہوا۔ نواب میر عثمان علی خان زمانہ شناس آدمی تھے۔ انھوں نے زمانہ کے بدلتے تیور کو محسوس کیا، دنیا میں ہونے والے انقلابات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے عوام کی بھلائی کے لئے جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ آصفیہ اور دارالترجمہ جیسے مفید ادارے قائم کئے۔ ان اخباروں نے بہت سے صحافیوں کو ادباء کی فہرست میں شامل کردیا۔ ان میں عبدالرحمٰن رئیس، حبیب اللہ رشدی، غلام احمد، حبیب اللہ اوج، سلطان بن عمر، عظیم الدین محبت، اشک، اکبر وفا قانی، بدر شکیب، نظر حیدر

آبادی، فصیح الدین پرچم، ابراہیم جلیس، حکیم انصاری نے جو ادبی خدمات انجام دیں، وہ ان اخبارات کی زینت ہیں۔

''ہزار داستان'' سے اردو کے ترقی پسند شاعر شاہد صدیقی بھی وابستہ تھے۔ شاہد صدیقی اپنی آخری سانسوں تک اردو صحافت سے وابستہ رہے۔ ان کے ادبی مضامین مشیر دکن، نظام گزٹ، صبح دکن، پیام اور ملاپ میں بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ مشیر دکن کے ساتھ جن صحافیوں کا تعلق تھا ان میں مجیب احمد تمنائی، وقار احمد، میر حسن، احسن علی مرزا کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔

''علم و عمل'' کا بڑا کارنامہ علم کی ترویج ہے۔ اس کے مندرجات میں خبروں کے علاوہ، اصلاح و تردید، نظم، سوانح عمریاں، اخلاق و ادب، کتابوں اور رسالوں پر ریویو، علوم و فنون، انتخابِ مضامین، صنعت و حرفت، زراعت، تجارت، مراسلات، ناولٹ ہوا کرتے تھے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و عمل کی وجہ سے ہمارے اخبارات نے سبھی شعبوں کا احاطہ کیا۔ علم و عمل میں انگلستان میں عام تعلیم کی ترقی، انڈیا آفس کا کتب خانہ جیسے معلوماتی مضامین پر بھی خبریں چھپتی تھیں۔ علم و عمل کی وجہ سے نہ صرف زبان و بیان میں انقلاب آیا بلکہ حیدرآباد کی جاگیردارانہ معاشرت میں بھی تبدیلی آئی۔ تعیش پسندی، ذہنی جمود کے خلاف قلم اٹھایا اور فکر و دانش کے چراغ روشن کیے۔

روزنامہ ''صحیفہ'' میں تاریخی مضامین کے علاوہ نظام دکن کی تازہ غزلیں صفحہ اول پر نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں۔ ان غزلوں کے ساتھ حضرت جلیل مانکپوری کی رائے بھی شائع کی جاتی تھی۔ رہبر دکن میں ہوش بلگرامی کے قلم سے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ مشہور اردو شاعر سلیمان اریب نے ۱۹۵۵ء میں ''صبا'' جاری کیا۔ وہ سب رس اور چراغ سے بھی وابستہ تھے۔ وقار خلیل نے ''۱۹۵۷ء میں ''انعام'' کے نام سے بچوں کا ایک معیاری رسالہ جاری کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے باذوق طلبا نے ''مجلّہ عثمانیہ'' کے علاوہ ''مجلّہ طیلسان'' بھی شائع کیا۔ ان تحقیقی و علمی مجلوں کے مدیروں میں ڈاکٹر زورؔ، مجید صدیقی، غلام دستگیر رشید، مہندر راج سکسینہ، سید محمد، محمد غوث، اکبرالدین صدیقی، انوار اللہ وغیرہ شامل تھے۔

حبیب الرحمٰن صاحب کی انجمن ترقی اردو ہند اور ڈاکٹر زورؔ کے ادارۂ ادبیات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جہاں اردو زبان و ادب کے مخلص خدمت گاروں نواب میر احمد علی خان، بیرسٹر اکبر علی خان، عابد علی خان، ہارون خان شیروانی، سجاد مرزا، حسینی شاہد، راج بہادر گوڑ، سرینواس لاہوٹی وغیرہ نے صحافت کے ذریعہ اردو کے فروغ میں زبردست حصہ لیا۔ منظور احمد صاحب کی جانب سے ''مجلس'' کی اجرائی عمل میں آئی۔ اس میں اردو ہال کے ماہانہ جلسوں کی روداد شائع ہوتی تھی۔ اس کے 'عبدالحق نمبر' اور 'مومن نمبر' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

ادارہ ادبیات کا ''سب رس'' ۱۹۳۸ء سے آج تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اردو زبان و ادب کے لئے سازگار حالات میں رسالہ ''سب رس'' کی اجرائی بجائے خود بڑا کارنامہ ہے۔ ان اداروں کی کارکردگی نے اردو کے لئے ایک نیا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ اور اب اردو صحافیوں کا نیا کارواں نئے معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں رواں دواں ہے۔

[مصادر: حیدرآباد میں اردو صحافت از طیب انصاری]

فاطمہ اختر ۔ایم۔اے، یوپی ٹی ریسرچ اسکالر (پی ایچ ڈی، اُردو) عثمانیہ یونیورسٹی

پروفیسر محمد انور الدین بہ حیثیت تحقیق نگار

ڈاکٹر راہی فدائی ''دکنی ادب کی تحقیق وتنقید اور محمد علی اثر'' مضمون میں لکھتے ہیں۔

''کسی بھی زبان کی ترقی وترویج میں اس کے دور اولیں کی پانچ صدیاں بے کار و بے معنی نہیں ہوتیں، خصوصاً اردو جیسی نوخیز وکم عمر زبان کے لیے تو یہ پانچ سو بہاریں نہایت وقیع اور بے حد یادگار ہونے کے علاوہ سرمایہ افتخار بھی ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر قدیم اردو ادب کی اس زبوں حالی خصوصاً دکنیات سے بے توجہی و بے اعتنائی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے ان سنگین حالات کے تدارک میں مصروف کار رہنے اور اپنے زور قلم سے ان احوال کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ رہنے والے معدودے چند مستشرقین اور ماہرین دکنیات میں چارلس اسٹیوارٹ، اشپرنگر، گارساں دتاسی، بلوم ہارٹ، حکیم شمس الحق قادری، مولوی عبدالحق، نصیر الدین ہاشمی، محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، افسر صدیقی، سخاوت مرزا، جمیل جالبی، شمس الرحمٰن فاروقی، سیدہ جعفر، گیان چند، معین الدین عقیل اور محمد علی اثر قابلِ ذکر ہیں۔ چناں چہ ان تمام محققین نے اپنے اپنے حوصلے کے مطابق اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قدیم اردو (دکنی ادب) کی جس طرح خدمت انجام دی وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ان محققین نے ایسی تاریک راہوں میں شمع علم جلایا ہے جہاں دور دور تک روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی تھی (بحوالہ: بجم دکنیات۔اول۔ پروفیسر محمد علی اثر۔ص۔10اور11)

تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔تاہم تحقیق میں جو لطف اور محنت ہے وہ شاید ہی کسی اور میدان میں ہو۔ ڈاکٹر محمد انور الدین نے بھی اسی دشت کی سیاحی کی ہے۔ جن کی کاوشوں کو دادِ تحقیق دیتے ہوئے گیان چند نے لکھا ہے:

''حیدرآباد کا پہلا رسالہ ایک طبی بلکہ ڈاکٹری پرچہ رسالہ طبابت تھا۔ دبستانِ آصفیہ جلد دوم میں مانک راؤ وٹھل راؤ نے اس کا سنہ اجراء ۱۲۷۷ھ لکھا ہے۔ شمس اللہ قادری نے ۱۲۷۵ھ دیا ہے۔ یہی تاریخ نصیر الدین ہاشمی، تمکین کاظمی اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے دہرادی۔ معاصر لکھنے والوں میں طیب انصاری اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے بھی حیدرآباد کے پہلے رسالے کو ۱۲۷۵ھ سے منسوب کیا لیکن انور الدین نے پہلا شمارہ تلاش کر کے حتمی طور پر طے کیا کہ یہ رسالہ ۱۲۷۶ھ میں جاری ہوا۔ اتفاق سے یہ حیدرآباد ہی کا نہیں پورے ملک کا پہلا طبی رسالہ تھا'' (بحوالہ ''حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔ص۔3)

پروفیسر محمد انور الدین کی تحقیق کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے:

''اقبال کی تحسین کے مسئلہ پر ڈاکٹر انور الدین نے نہایت معروضی انداز میں اقبال کے ناقدین کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔ اقبال کے اُسلوب پر بھی ان کی تحریر اہمیت رکھتی ہے لیکن اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' پر ان کی تحقیق اپنا جواب آپ ہے۔ یہ مضمون اقبالیات میں اپنی جگہ رکھے گا۔ فراقؔ کے عشق اور فانیؔ کے شعری سفر کے بارے میں ان کا مطالعہ غور وفکر کا حامل ہے۔ خصوصاً فانیؔ کی یاسیت کا تجزیہ اعتبار رکھتا ہے۔ اکبر کے مکاتیب پر ہمارے ہاں کم ہی لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد انور الدین نے اس موضوع کا خوبی کے ساتھ محاسبہ کیا ہے کہ اکبر الہ آبادی کی شخصیت کے کئی پہلو اظہر من الشمس ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک اچھا مضمون ہے۔ جدیدیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد انور الدین جدیدیت کو ترقی

پسندی کا ردِعمل قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون مختصر لیکن جامع ہے۔ اردوناول میں حقیقت نگاری کے رجحانات پر بھی انہوں نے اچھی بحث کی ہے۔ دکنیات پر ان کے تینوں مضامین میں "ابن نشاطی اور پھول بن" معرکہ آراء ہے۔ دکنیات پر ہمارے ہاں تحقیق خاصی کی گئی ہے اور تنقید کم۔ ڈاکٹر انورالدین نے یہاں تنقیدی زاویہ سے زیادہ کام لیا ہے اور خوبی کے ساتھ۔ استاد محترم پروفیسر سروری صاحب کی شخصیت اور تصانیف پر ڈاکٹر محمد انورالدین نے غیر معمولی محنت سے قلم اٹھایا ہے کہ سروری صاحب کی دلنواز شخصیت کچھ اور دلنواز ہوجاتی ہے۔ صحافت پر ڈاکٹر محمد انورالدین کے پانچ مضامین ہیں۔ یہ تحقیقی نوعیت کے بھی ہیں اور تنقیدی نوعیت کے بھی، اسی کے ساتھ معلومات آفریں بھی۔ ڈاکٹر محمد انورالدین کے شستہ اندازِ تحریر نے ان مضامین کو خوشگوار اور دلچسپ بنادیا ہے" (بحوالہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد، صفحہ۔4، 30رجون 1997ء)۔

پروفیسر محمد انورالدین نے اپنے تحقیقی مقالے "ڈاکٹر زور کی مرتبہ تواریخ ادب وتذکرے" میں ڈاکٹر زور کو دکنی تحقیق کے میر قافلہ اور اردو میں لسانیات کے ابوالآباء بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"انھوں (ڈاکٹر زور) نے ادب کے مختلف شعبوں کو اپنے فکرونظر کی جولان گاہ بنایا۔ تنقید، تحقیق، لسانیات، صوتیات، افسانہ نگاری، ادبی تاریخ، سوانح نگاری، مکتوب نگاری، شاعری غرض یہ کہ ادب کا کونسا پہلو تھا جسے ان کے کلک گہربار نے اپنی تراوش سے نہیں سنوارا۔ موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی کے اعتبار سے اردو کا شاید ہی کوئی اہل قلم ان کی برابری کا دعویٰ کرسکتا ہے" (بحوالہ "اذکار واخبار" ص۔44)

موصوف نے ڈاکٹر زور کی چار کتابیں (1) اردو شہ پارے (2) تاریخ ادب اردو (3) دکنی ادب کی تاریخ (4) داستانِ ادبِ حیدرآباد کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر زور کی تحقیق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو شہ پارے کے بارے میں بتایا ہے کہ جس وقت ڈاکٹر زور اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل اور اردو زبان کے لسانی اور صوتیاتی مسائل پر تحقیقی کام کے سلسلہ میں لندن اور پیرس میں مقیم تھے اس وقت آکسفرڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی نایاب قلمی کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ ان میں بعض وہ تھے جن کے نسخے ہندوستان میں نہیں تھے۔ اس ادبی ذخیرے کے بیشتر حصوں کا انتخاب جمع کیا۔ حیدرآباد آنے کے بعد ان انتخابات میں مزید کا اضافہ کیا جن میں

"نواب عنایت جنگ بہادر اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے گراں قدر کتب خانوں میں مخزونہ بعض نادرونایاب مخطوطات کے انتخابات شامل ہیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے قلمی نسخوں میں انھیں عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی کی تصاویر دستیاب ہوئیں۔ محکمہ آثار قدیمہ (سابقہ ریاست حیدرآباد کے گنجینۂ نوادرات) سے انھوں نے علی عادل شاہ دوم، سید شاہ راجو، ابوالحسن تاناشاہ اور محمد قلی قطب شاہ کی تصاویر کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی چند اردو غزلوں کے خوش خط قطعات جوانھیں کے دور میں انھیں کے لیے بطور وصلی لکھے گئے تھے کے فوٹوز حاصل کئے اور ان سب کو اس کتاب میں شامل کیا" (بحوالہ: اذکار واخبار، ص۔45)

پروفیسر محمد انورالدین، ڈاکٹر زور کی کتاب "اردو شہہ پارے" کے حوالے سے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کتاب نے ولی اورنگ آبادی سے ماقبل کی تاریخ کو روشنی میں لانے کا کام کیا ہے۔ کتاب میں ادبیت کو ترجیح دی گئی ہے اور تاریخ وار مرتب کرتے ہوئے اردو زبان وادب کے ارتقاء کو دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ 1929ء میں شائع یہ کتاب دکنی ادب کی تحقیق میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ آگے کے صفحات میں لکھا ہے کہ:

"اس میں کوئی دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ اردو شہہ پارے کی اشاعت نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور بزرگی قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا" اس بات کا بھی اظہار محمد انورالدین نے کیا ہے کہ ایسے کام خالی از اسقام نہیں ہوتے۔ اس کا احساس ڈاکٹر زور کو تھا۔ جس

کا اظہار کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے کیا ہے۔ جس کا حوالہ دینے کے بعد ڈاکٹر محمد انور الدین لکھتے ہیں:

''اسے زور صاحب کی بصیرت کہیے یا پیش بینی کا کمال کہ ان کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ چناں چہ مابعد دور میں دکنیات کے میدان میں جو نئی نئی تحقیقات ہوئیں، ان کی روشنی میں اردو شہہ پارے کے بعض مندرجات اور بیانات تصحیح طلب قرار پائے'' (بحوالہ: اذکار واخبار۔ص۔48)

پروفیسر محمد انور الدین نے اس کے بعد ڈاکٹر زور کی دوسری کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کے مشمولات کا جائزہ لیا ہے اور اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو ہے لیکن دراصل یہ ڈاکٹر زور ہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ جس کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر انور الدین لکھتے ہیں:

''ماہنامہ سب رس 1963ء یادگار زور نمبر میں ڈاکٹر زور کے مقالہ نما کے مرتب وقار خلیل نے اس کتاب کو ڈاکٹر زور کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ (ص:390)'' اس کے بعد اس کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے کوئی خاص بات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ البتہ کتاب کے چوتھے حصہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس حصے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر زور نے دکن کے بعض اہم شاعروں اور نثر نگاروں کو تاریخ ادب اردو کی پوری روایت کے پس منظر میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ دکن کے اہلِ قلم میں گردھاری پرشاد باقی، ڈاکٹر احمد حسین مائل، جلال الدین توفیق، رضی الدین حسن کیفی اور طیبہ بیگم کا ذکر شامل ہے'' (بحوالہ: اذکار واخبار۔ص۔50)

آخر میں ڈاکٹر محمد انور الدین نے جو بات لکھی ہے وہ ان کے تحقیقی مزاج کے عین مطابق ہے۔ وہ مذکورہ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر زور کے مطابق تحقیقی وسائنٹفک بنیاد پر مرتب کی گئی ہے لیکن ظاہر ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران تحقیق وتنقید نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی روشنی میں اس کتاب کی کئی باتیں ساقط الاعتبار قرار پائی ہیں لیکن اختصار وجامعیت کے پہلو سے یہ کتاب بہرحال اپنی قدر وقیمت رکھتی ہے'' (ایضاً۔ص۔50)

وہ کئی باتیں جو ساقط اعتبار قرار پاتی ہیں، اس کا تذکرہ ڈاکٹر انور الدین نے نہیں کیا ہے۔ اگر تذکرہ کردیتے تو مناسب ہوتا اور تحقیق کرنے والے افراد اور ریسرچ اسکالر کو آسانی ہوتی۔ مبصر جب کسی کتاب پر تبصرہ کرتا ہے تو اس کو یہ سب زیب دیتا ہے لیکن مضمون نگار کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اہم چیزوں کا تذکرہ کرے۔ یعنی کوئی اہم چیز مضمون میں جگہ پانے سے نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر زور کی تیسری کتاب ''دکنی ادب کی تاریخ'' کے بارے میں پروفیسر انور الدین نے لکھا ہے کہ:

''دکنی ادب کی تواریخ میں زور صاحب کی یہ تصنیف اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1960ء میں منظر عام پر آئی۔ اور تب سے آج تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ زائد از ربع صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود اس کی اہمیت اور افادیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی'' (بحوالہ: اذکار واخبار۔ص۔50)۔

یہ کتاب 1350ء سے 1750ء پورے چار سو سال کی تاریخ اپنے اندر رکھتی ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب دکن کے قدیم ادبی مراکز بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور گولکنڈہ کے ادبی فنکاروں کی زندگی، ان کا فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں بیش بہا معلومات رکھتی ہے۔ پہلے باب میں ''عہد بہمنی'' کے عنوان کے تحت جن شعراء کے حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ان میں شیخ عین الدین گنج العلم، سید محمد حسینی حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فخر دین نظامی، مشتاق، لطفی، فیروز بیدری، اشرف، شاہ میراں جی شمس العشاق اور سید شہباز

حسینی شامل ہیں۔ پروفیسر محمد انور الدین لکھتے ہیں کہ شیخ عین الدین گنج العلم سے منسوب دکنی تصنیفات معروف الاسم اور معدوم الوجود ہیں۔ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب معراج العاشقین ڈاکٹر حفیظ قتیل مرحوم کی تحقیق کے مطابق مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی تصنیف ثابت ہو چکی ہے۔

دوسرا باب ''عادل شاہی عہد'' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس باب میں عبدل بیجاپوری، مقیمی، حسن شوقی، شاہ برہان الدین جانم، نصرتی اور ہاشمی کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں قطب شاہی عہد کے نمائندہ سخن سازوں اور سخن طرازوں کے حالات زندگی کو بتلایا گیا ہے جن میں محمد قلی قطب شاہ، ملا خیالی، محمود، فیروز بیدری، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، شاہ راجو اور طبعی وغیرہ ہیں۔ پانچویں باب میں ''مغل عہد، حیدرآباد اور اورنگ آباد'' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں 17ویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اول کے جن دکنی شعراء اور ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں بحری، عشرتی، شاہ حسین ذوقی، وجدی، فراقی، ضعیفی، ولی ویلوری، ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کے نام اہم ہیں۔

کتاب کا آخری باب ''دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کے اردو پر'' ہے۔ اس کے بارے میں پروفیسر محمد انور الدین نے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر زور نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ شمالی ہند میں اردو زبان میں تخلیقی ادب کی روایت کا آغاز دکن کی شعری روایت کے زیر اثر ہوا۔'' اس کتاب کے بارے میں خود مصنف نے لکھا ہے کہ ''گو یہ کتاب دکنی ادب کی تاریخ پر حرفِ آخر نہیں لیکن دکن کی علمی وادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں، طلبہ اور عوام میں متعارف کرانے کا ایک ذریعہ ہے'' (بحوالہ: اذکار واخبار۔ص۔52)

داستان ادب حیدرآباد:۔ 1951ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں 1000ء سے 1370ء یعنی تقریباً پونے چار صدیوں کے دوران، شہر حیدرآباد کی علمی وادبی تحریکات اور ان کے پس منظر نیز یہاں کے مردم خیز سرزمین سے اٹھنے والے اربابِ علم ودانش اور اصحابِ کمال کی تصانیف کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

موجودہ حیدرآباد جس قدر دلچسپ اور سیاحوں کے لیے دلکشی رکھتا ہے، اس سے زائد دلچسپی حیدرآباد قدیم کی تاریخ سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ حیدرآباد سے محبت کرتے اور اس کی تاریخ کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ ''داستانِ ادب حیدرآباد'' ضرور اپنے پاس رکھنا پسند کریں گے۔ دکنی ادب پر تحقیق ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کون مخطوطہ پڑھے۔ اس کو سمجھے اور پھر تحریر کے ذریعہ لوگوں کو سمجھائے۔ لیکن یہ کام پروفیسر محمد انور الدین نے بھی کر دکھایا ہے۔ پھول بن کے سنہ تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''پھول بن کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یوروپی مصنف اسٹوراٹ نے اس کا سنہ تصنیف 1059ھ م 1649ء بیان کیا ہے۔ ہندوستانی و پاکستانی محققین میں ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالاتفاق اس کی تاریخ تصنیف 1066ھ م 1655ء قرار دی ہے لیکن اب پھول بن کا صحیح تر نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ جس کی مدد سے 1955ء میں شیخ چاند ابن حسین نے اس کو ترتیب دیا ہے۔ حیدرآباد کے گورنمنٹ اورنٹل مینواسکرپٹ لائبریری میں بھی اس کا ایک عمدہ مکمل نسخہ موجود ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی 1076ھ م 1665ء میں مکمل ہوئی۔ قطعہ تاریخ یہ ہے

صفادار اس کی دیکھ ہر ایک چمن میں
دکھیا ہوں ناؤں اس کا پھول بن میں
اٹھا تاریخ لایا تو یہ گلزار
گیارہ سوکوں کو کم تھے بیس پر چار

گیارہ سو میں سے بیس پر چار یعنی چوبیس کم کرنے سے 1076ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چوں کہ بعض نسخوں میں آخری مصرع کے بیس کو تیس پڑھا جا سکتا تھا۔ اس سے التباس ہو رہا تھا لیکن اب گورنمنٹ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کے نسخوں سے

التباس باقی نہیں رہا۔ اور 1076ھ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، شیخ چاند، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی یہی سال صحیح مانا ہے۔ اس لیے پھول بن کی سنہ تصنیف 1076ھ م 1665ء قرار پاتا ہے۔ (بحوالہ: ماہنامہ شاداب حیدرآباد، جولائی 1988ء، جلد 5، شمارہ 4، ص۔ 32-33)

انورالدین نے نہ صرف خود تحقیق کی ہے بلکہ جہاں کہیں ایسی کوئی کتاب جو تحقیق سے متعلق ہو منظر عام پر آجائے تو انھوں نے اس پر مضمون لکھ کر اس کتاب کو بھی قارئین تک پہنچا کر قارئین کے تحقیقی ذوق کی تسکین کا سامان بھی کیا ہے۔ ایسا ہی ایک تبصرہ ماہنامہ ''آندھرا پردیش'' میں ''تحقیقات۔ دکنی تحقیق میں ایک وقیع اضافہ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نئی پود میں دکنی اور دکنیات سے لگاؤ اور شغف باقی نہیں رہا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک طرح کا متوحشانہ رویہ اور گریز کا رجحان عام ہے۔ اس طرح یہ میدان ایک عرصہ دراز سے کسی تازہ وارد سیاح کی دشت پیمائی کا منتظر تھا۔ دکن کے اس سونے میکدے کے مئے مرد افگن تحقیق کے حریص ہونے کا اعزاز حیدرآباد کے ایک جواں سال محقق محمد نسیم الدین فریس کے حصہ میں آیا جس کی تصنیف ''تحقیقات'' کے عنوان سے 1993ء کے اواخر میں منصۂ شہود پر آئی۔ چکی ناموں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ میں مصنف نے پورے اعتماد کے ساتھ سابقہ محققین جیسے ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی کے تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مصنف نے قدیم مخطوطات کے ذخائر سے بعض نئے چکی نامے اور بعض نامعلوم چکی ناموں کے نئے متون دریافت کئے ہیں۔ (ص۔ 13-14) نسیم الدین فریس نے نہایت تحقیق و جستجو سے دکنی کی قدیم مخطوطات کا مطالعہ کر کے بعض ایسی اصناف دریافت کی ہیں جو اب تک نامعلوم تھیں۔ اس مضمون میں دکنی کی تین متروک اصناف چار کرسی، برہنی، کھاڑا کا تعارف کرایا ہے۔ فاضل مصنف نے ان میں سے ہر صنف کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کے فن اور مواد کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ (ص۔ 15) ''تحقیقات'' کا اگلا مضمون ایک نایاب چرخہ نامہ ہے اس میں فاضل مصنف نے دکن کے ایک قدیم چرخہ نامہ کا تعارف کرایا ہے۔ یہ چرخہ نامہ انھیں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی ایک قدیم بیاض سے دستیاب ہوا۔ چرخہ ناموں کے سلسلہ میں عام طور پر محققین صرف ایک ہی چرخہ نامہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کے نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی زینت ہیں۔ نسیم الدین کا دریافت کردہ چرخہ نامہ اس سلسلے کی دوسری مثال ہے۔ یہ چرخہ نامہ سیدی برہان کا مصنفہ ہے جسے اس مضمون میں تنقیدی نوٹ اور تدوین متن کے ساتھ پیش کر کے مصنف نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے (ص۔ 15,16) مجموعی اعتبار سے تحقیقات، دکنیات کے میدان میں ایک گراں اضافہ ہے، جس کے ذریعہ دکنی کے بعض قدیم شعراء، اور قدیم شہ پارے، اور قدیم اصناف کو پہلی مرتبہ دنیائے علم و تحقیق سے آشنا کرایا گیا ہے۔ (بحوالہ: ماہنامہ آندھرا پردیش حیدرآباد، اکٹوبر 1995ء، ص۔ 16)

مجموعی طور پر پروفیسر محمد انورالدین کی تحقیق کا انداز طالب علمانہ بھی ہے اور محققانہ بھی ہے۔ جہاں کہیں سے کوئی اہم بات اور تحقیق کا پتہ چلا ہے انھوں نے اس کو یکجا کر کے دنیائے علم و ادب تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ گو ان کی تحقیق کو سند کا درجہ تو نہیں دیا گیا ہے لیکن وہ ایک معتبر اور قابل ذکر محقق ضرور ہیں۔ اور ان کی تحقیق اور رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ کتب :

۱۔ معجم دکنیات۔ اول: پروفیسر محمد علی اثر

۲۔ حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل، تحقیقی و تنقیدی جائزہ : پروفیسر محمد انورالدین

۳۔ اذکار و اخبار: ڈاکٹر محمد انورالدین

۴۔ روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد، 30/ جون 1997ء

۵۔ ماہنامہ سب رس 1963ء یادگار زور نمبر

۶۔ ماہنامہ شاداب حیدرآباد، جولائی 1988ء، جلد 5، شمارہ 4

۷۔ ماہنامہ آندھرا پردیش حیدرآباد، اکٹوبر 1995ء

شیخ محمد سراج الدین۔ ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

ٹیپو سلطان اور نیپولین

اے شہید مرد میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پر لاکھوں رحمتیں لاانتہا تجھ پر سلام
ہند کی قسمت میں ہی رسوائی کا سامان تھا
ورنہ تو بھی اہلِ آزادی کا ایک عنوان تھا
اپنے ہاتھوں خود تجھے اہل وطن نے کھو دیا
آہ ! کیا باغبان شاہِ چمن نے کھو دیا

شیر میسور شہید ٹیپو سلطان، سلطان حیدر علی کے سب سے بڑے فرزند، بھارت کے مصلح وحریت پسند حکمران بین المذاہب، ہم آہنگی کی زندہ جاوید مثال اور فوجی راکٹ کے موجد تھے۔

ٹیپو سلطان 20 نومبر 1750ء کو دیون ہلی میں پیدا ہوئے۔ موجودہ دور میں یہ بنگلور دیہی ضلع کا مقام ہے۔ جو بنگلور شہر سے 33 کلو میٹر شمال میں واقع ہے۔

ٹیپو سلطان کا نام آرکاٹ کے بزرگ کے نام کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اسے اپنے دادا فتح محمد کے نام کی مناسبت سے فتح علی بھی کہا جاتا ہے۔ والد بزرگوار حیدر علی نے ٹیپو سلطان کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔

فوج اور سیاسی امور میں ٹیپو سلطان کو نوعمری میں ہی شامل کیا گیا تھا۔ 17 سال کی عمر کے ٹیپو سلطان کو اہم سفارتی اور فوجی امور پر آزادانہ اختیارات دے دیئے گئے تھے۔ ان کے والد حیدر علی جنوبی بھارت کے سب سے زیادہ طاقتور حکمران کے طور پر اُبھر کر آئے تھے۔

ٹیپو سلطان کی زندگی ایک سچے مسلمان کی زندگی تھی۔ وہ مذہبی تعصب سے پاک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ غیر مسلم بھی ان کی افواج اور ریاست میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

ٹیپو سلطان نے اپنے مملکت کو ''مملکت خداداد'' کا نام دیا۔ حکمران ہونے کے باوجود خود کو عام سمجھتے تھے۔ ہمیشہ باوضو رہنا اور تلاوت قرآن آپ کی معمولات میں سے تھے۔ ہر شاہی فرمان کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا کرتے تھے۔ زمین پر سویا کرتے تھے۔ آپ کو عربی فارسی، اردو، فرانسیسی کی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ آپ کا مطالعہ وسیع تھا اور مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔ کافی کتب خانوں کے مالک تھے۔ جس میں کتابوں کی کم وبیش تعداد (2000) دو ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ سائنسی علوم میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کو برصغیر میں راکٹ کا موجد کہا جاتا ہے۔

شہید ٹیپو سلطانؒ نے برطانوی سامراج کے خلاف ایک مضبوط مذاحمت فراہم کی، برصغیر کے لوگوں کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرنے کیلئے سنجیدہ اور عملی اقدامات کئے۔ ٹیپو سلطان نے صنعت وتجارت کو فروغ دیا۔ اور انتظامیہ کو از سر نو منظم کیا۔ شہید ٹیپو سلطان کو اس بات سے اتفاق تھا کہ برصغیر کے لوگوں کا پہلا مسئلہ برطانوی

اخراج ہے۔

نظام اور مراٹھوں نے ٹیپو سلطان کی طاقت کو اپنی بقا کیلئے خطرہ سمجھا اور انگریزوں سے اتحاد کرلیا تھا۔ ٹیپو سلطان نے ترکی ایران، افغانستان اور فرانس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خط و کتابت کے ذریعے سے مگر کامیاب نہ ہوسکے۔

جب ٹیپو سلطان نے افغانی بادشاہ سے مدد حاصل کرنے کیلئے، خط و کتابت کی تو انہوں نے اطمینان سے رہنے کی صلاح دی۔ اس کے بعد شہید ٹیپو سلطان کی طبیعت میں بے چینی سی تھی۔ اچانک ان کے ذہن میں نپولین کا خیال آیا تو انہوں نے خط لکھا اور مدد طلب کی۔ ''نپولین کا تعارف پیش خدمت ہے''۔

عظیم فرانسیسی سپہ سالار اور شہنشاہ نپولین لوناپاٹ 1769ء میں پیدا ہوئے۔ اس میں قوم پرستی کا جذبہ تھا اور وہ فرانس کو غاصبین تصور کرتا تھا۔ نپولین کو فرانس میں عسکری اداروں میں بھیجا گیا۔ جہاں 1785ء میں 16 سال کی عمر میں گریجویشن کیا اور فرانس فوج میں لیفٹننٹ بن گیا۔

4 سال بعد انقلاب فرانس کا آغاز ہوا۔ اور چند برسوں میں نئی فرانسیسی حکومت متعدد بیرونی طاقتوں سے برسر پیکار ہوئی۔ خود نپولین کو نمایاں کرنے کا پہلا موقع 1793ء میں تولون کے محاصرے کے موقع پر ملا۔ جس میں فرانسیسی شہر کو انگریزوں سے آزاد کروالیا۔ اس محاذ کو وہ توپ کو فرانسیسی باشندہ تصور کرنے لگا تھا۔

تولون اس کی کامیابیوں کے صلہ میں اسے بریگیڈر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ 1796ء میں اسے اٹلی میں فرانسیسی کی فوج کی کمان سونپی گئی۔

وہاں 1796ء تا 1797ء تک نپولین نے شاندار فتوحات حاصل کیں۔ ملک واپسی پر اس کا ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا۔ 1798ء میں نپولین نے مصر میں فرانسیسی یلغار کی قیادت کی، اسے مات ہوئی۔

1799ء میں نپولین اپنی فوج سے فرانس واپس آگیا۔ واپسی کے ایک ماہ بعد Ab csez کے ساتھ فوجی انقلاب میں حصہ لیا یہ جنگ ایک نئی حکومت کے قیام میں مسلح ہوئی اور نپولین اس کا سربراہ بن گیا۔

نپولین کا اقتدار پر قابض ہونے کا عمل سبق اور تھا۔ اگست 1793ء تولون کے محاصرے سے پہلے وہ ایک 24 برس کا گمنام معمولی افسر تھا۔ جو محض 6 سال کے عرصہ میں جبکہ نپولین کی عمر فقط 30 برس تھی۔ وہ فرانس کا ایک غیر متنازعہ حکمران بن گیا۔ جس عہدے پر اگلے 14 برس فائز رہا۔

اس نے اپنی قوم کیلئے ''نپولین کوڈ'' بنایا تھا۔ نپولین ہمیشہ سے انقلاب کا محافظ رہا۔ 1804ء میں خود کو فرانس کا شہنشاہ قرار دیا۔ نپولین کو زمینی جنگوں میں مسلسل کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔ تاریخ کا بہترین سپہ سالار مانا جاتا ہے۔

قارئین یہ تھا تعارف نپولین کا۔ فرانسیسی بادشاہ نپولین اور شہید ٹیپو سلطان کے درمیان خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ ٹیپو سلطان اور نپولین میں کئی چیزیں مشترکہ تھیں۔ مثلاً دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، دونوں ذہین، دوراندیش، چالاک، حوصلہ مند، رعایا پرور، جنگی محاذ پر ڈٹے رہنا، دونوں کا مقصد انگریزوں کو اقتدار سے محروم

وخارج کرنا ۔ اپنی اپنی سلطنتوں کی حفاظت کرنا ۔ وغیرہ وغیرہ۔

ٹیپوسلطان وعیپولین میں سولہ سترہ سال کا فرق تھا ۔ ٹیپوسلطان عیپولین سے سولہ سترہ سال بڑے تھے ۔ ٹیپوسلطان میں خداداد صلاحتیں تھیں وہ ہر ایک کا احترام کرتے تھے۔انہوں نے عیپولین کو فبروری 1799 میں خط لکھا اور بھارت میں انگریزوں کا ظلم وجبر بیان کیا۔اورحملہ کی دعوت دیتے ہوئے بھارت کے خفیہ راستے جس میں باآسانی داخل ہوسکتے ہیں بتایااور ترکیبیں بتائیں ۔اور ساتھ ہی ساتھ معاہدہ بھی لکھا کہ عیپولین کو کون کونسی جاگیریں عطا کی جائیں گی ۔اور انگریزوں سے تاوان بھی لیا جائے گا ۔ ٹیپوسلطان نے عیپولین کی مدد کیلئے ایک وفد بھیجا۔

یہ خط ایک وفد کے ساتھ بھیجا۔یہ وفد بنگلور سے ہوتا ہوا مارلیش پہنچا اور اس نے بندرگاہ سے اترتے ہی سلطان ٹیپو کا پرچم بلند کیا۔

مارلیش کی فرانسی حکومت نے اس وفد کا شاندار طریقے سے اعلانیہ استقبال کیا۔اس وفد کے پہنچنے سے پہلے فرانسیوں کو نہ تو سلطان کی امداد کا خیال تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ سلطان انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے والے ہیں۔

انگریزوں کو اس مراسلت کی خبر پہنچ چکی تھی ۔اور یہ کام انگریزوں کے گرگوں یعنی سلطنت خداداد کے نمک حراموں اور غداروں نے کیا۔عیپولین جب خط وکتابت کرتے تو ٹیپو صاحب ہندوستان کے بادشاہ کے القاب سے مخاطب کرتا۔اگرعیپولین کو سیریا میں شکست نہیں ہوتی تو شاید تاریخ کچھ اور ہوتی۔

یاوؔر حبیب ڈار ۔بڈکوٹ ہندوارہ کپوارہ کشمیر

دُعـــا

دُعا ہے یہ میری خُدایا تُو سُن لے
مجھے نیک بندوں میں یارب تُو چُن لے
مُجھے سیدھا رستہ دِکھا میرے مالک
مرے خستہ دل کو جگا میرے مالک
گُناہوں کے دلدل میں آ کے پھنسا ہوں
درِ یار پے میں فُسردہ پڑا ہوں
تُو شاہِ جہاں ہے تُو رحمت سدا ہے
دکھانے کو تیرے مرے پاس کیا ہے
سدا گونجتی ہے یہاں ذکرِ تیرا
خودی کے نشے میں کروں فکرِ تیرا
اُجالا تو کر دے مری زندگی میں
کروں زندگی میں فدا بندگی میں
گُناہوں سے یا رب کرم مانگتا ہوں
ترا بندہ ہو کے اِرم مانگتا ہوں
کہاں جاؤں تیرے سوا کون میرا
ترا بول بالا تُو مالک تُو آقا
پڑا در پہ سرخم میں یاوؔر جیا اب
گُناہوں کی بخشش سے پاؤں خدا اب

آمینہ اختر ۔ایم۔اے، یوپی ٹی ریسرچ اسکالر (پی ایچ ڈی، اردو)، عثمانیہ یونیورسٹی

اردو ادب اور شاعری

زبانیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک مفرد اور دوسری مرکب۔ مفرد زبانیں وہ ہوتی ہیں جو کسی مخصوص ملک، قوم یا علاقہ کی حد تک ہی محدود ہوتی ہیں۔ ان علاقوں میں دیگر اقوام کی آمد اور دخل اندازی نہ ہوئی ہو یہ زبانیں بالکل خالص ہوتی ہیں۔ ابتداء میں زبانیں صرف بولیاں تھیں جو بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے قومیں متمدن اور مہذب ہوتی گئیں زبانوں کی تحریر کا آغاز ہوتا گیا۔ اسی زبان کا ادب بھی وجود میں آتا گیا۔ اس طرح بولی، زبان کی شکل اختیار کرگئی۔ ادب اپنے ماحول اور تمدن وتہذیب کا عکاس ہوتا ہے، ادیب حساس ہوتا ہے وہ اپنے ماحول، ملک کی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوتا ہے اور اسی کے لحاظ سے ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ ہر زبان کے ادب کو مزید دو زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک نثر اور دوسرا نظم۔

اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ یہاں پروان چڑھی اور اس کا ارتقاء ہوا۔ ''اردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''لشکر'' کے ہیں اسی لیے ابتداء میں اسے لشکری زبان بھی کہا جاتا تھا۔ اس زبان کا نام بذات خود اس کا تعارف ہے۔ اردو بے شک ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی اور بڑھی لیکن یہ کوئی مفرد زبان نہیں بلکہ ایک مرکب زبان ہے۔ مشہور محاورہ ہے کہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے''۔ اردو کی ایجاد بھی ضرورت ہی کا نتیجہ ہے۔ برصغیر میں ہندوستان ہمیشہ سے ہی بیرونی حملہ آوروں کے لیے پرکشش سرزمین رہی ہے۔ یہ ایک زرخیز سرزمین تھی۔ یہاں کی زمینیں سونا اگلتی تھیں۔ چناں چہ ہندوستان کو ''سونے کی چڑیا'' کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی کاشتکار کھیتوں میں بھرپور فصل اُگاتے تھے۔

ہندوستان پر سب سے پہلے حملہ آور ہونے والی قوم آریاء تھی چوں کہ آریاء کاشتکاری کے فن سے ناواقف تھے۔ ان کا طرز زندگی مویشی پالنے اور ان کی افزائش نسل پر مبنی تھا۔ انھیں مویشیوں کا دودھ اور گوشت آریاؤں کی غذا تھی۔ چناں چہ اس قوم کے پاس بے شمار جانوروں کے ریوڑ ہوتے تھے۔ ان ریوڑوں کی غذا کے لیے آریاؤں کو سرسبز چراگاہوں کی تلاش ہوتی تھی۔ چوں کہ یہ قوم کھیتی باڑی سے ناواقف تھی اس لیے جب کسی سرزمین کا چارہ ختم ہوجاتا تو یہ قوم اپنے مویشیوں کے گلوں یا ریوڑوں کے ساتھ کسی اور سرسبز وشاداب سرزمین کی تلاش میں نکل پڑتے اور جب کوئی ایسی سرسبز وشاداب زمین مل جاتی تو وہیں مقیم ہوجاتے اور ان کا یہ قیام اسی وقت تک برقرار رہتا جب تک کہ وہاں کی چراگاہیں ان کے مویشیوں کا پیٹ بھرتی رہتیں۔ بہ الفاظ دیگر اس قوم کی زندگی خانہ بدوشوں کی زندگی تھی۔ ان کے اس طرزِ زندگی کی بدولت انہوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں کی آبادی بنیادی طور پر کاشتکار تھی، جسے دراوڑی کہتے ہیں۔ جو خانہ بدوشی آریاؤں کی عصری ہتھیاروں کا سامنا نہ کرسکی اور اسے جنوبی ہند کی

طرف پسپا ہونا پڑا۔

ہندوستان میں آریاؤں کی طرح ہی دیگر اقوام یکے بعد دیگرے حملہ آور ہوتی رہیں۔ پٹھان آئے، عرب آئے، ترک آئے اور انگریز بھی آئے۔ ہندوستان کے فراخدل سینے نے ان سب کو گلے لگالیا اور وہ یہیں کے ہوگئے، سوائے انگریزوں کے جو صرف یہاں تجارت کرنے اور یہاں کی دولت لوٹ کر اپنے وطن انگلستان منتقل کرنے کے لیے آئے تھے۔ یہاں دوسو سال سے زیادہ قیام کے باوجود یہاں کے نہ ہوسکے۔ انگریزوں کے سوائے باقی جتنی اقوام ہندوستان آئیں انھوں نے ہندوستان کو اور ہندوستان نے انھیں اپنالیا۔ چناں چہ ان اقوام کے ہندوستان میں مستقل قیام کی وجہ سے انھیں مقامی آبادی سے روابط کی ضرورت بھی پیش آئی۔ وہ اپنا مافی الضمیر ان کی اپنی زبان میں ظاہر کرتے اور مقامی افراد اپنی زبان میں جواب دیتے۔ اس طرح حملہ آوروں کی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے اختلاط کے نتیجہ میں ایک نئی مخلوط زبان وجود میں آئی۔ جو حملہ آوروں کی زبانوں اور مقامی زبانوں کا امتزاج تھی۔ چونکہ یہ زبان حملہ آوروں کے سپاہیوں اور مقامی آبادی کے باہمی ارتباط کا نتیجہ تھی چناں چہ اس زبان کا نام ''اردو'' یعنی ''لشکری'' زبان پڑ گیا۔

انسان چاہے کرۂ ارض کے کسی خطے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو جذبات واحساسات سے عاری نہیں ہوتا۔ اس کے جذبات واحساسات پر حالات کے اعتبار سے خوشی وغم کے جذبات کا غلبہ ہوتا رہتا ہے۔ چوں کہ انسان ''حیوان ناطق'' ہے وہ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار گیت کی شکل میں بھی کرتا ہے۔ اس کے ان گیتوں کے لیے کبھی حزنیہ ہوتی ہے تو کبھی طربیہ، چناں چہ کسی بھی زبان کے ادب میں پہلے تشکیل شاعری کی ہوتی ہے۔ چاہے اس وقت تک اس انسانی بولی کا درجہ صرف بولی کا ہی کیوں نہ ہو۔ شاعری پہلے وجود میں آتی ہے۔ جب انسان کی بولی اس کے متمدن اور مہذب ہونے اور رسم الخط یا تحریر کے وجود میں آنے کے بعد نثر کا ظہور ہوتا ہے۔ گویا ہر زبان کے ادب میں شاعری پہلے وجود میں آتی ہے اور نثر اس کے بعد۔ یہی کچھ اردو کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کی بھی پہلے شاعری وجود میں آئی اور اس کے بعد نثر ان دونوں اقسام یا اصناف کا مجموعہ اردو ادب کہلایا۔

شاعری:

جیسا کہ اردو ادب کے تعارف میں ذکر آچکا ہے۔ کسی بھی زبان کی تاریخ میں شاعری، نثر سے پہلے وجود میں آتی ہے۔ چناں چہ اردو ادب میں بھی شاعری پہلے پیدا ہوئی اور نثر کی تخلیق بعد میں عمل میں آئی۔ عربی میں شاعری کی مختصر ترین لیکن جامع ترین تعریف کی گئی ہے۔ عرب شاعری کو ''کلام موزوں'' کہتے ہیں۔ یعنی ایسی بات جو موزوں بھی ہو۔ یہ کلام جب سنایا جائے تو سامع اس کے زیر اثر بے اختیار تھر کنے لگے۔ شاعری کی نوعیت کا انحصار ان زبان دانوں کے ماحول، سماج اور معاشرہ پر ہوتا ہے۔ ہندوستان جہاں اردو پیدا ہوئی اور پروان چڑھی، چوں کہ یہ ایک مرفع الحال ملک تھا۔ اس کی اکثریت خوشحال تھی۔ چنانچہ اردو شاعری کی ابتداء بھی خوشی ومسرت کے ترانوں سے ہوئی۔ خوشحال عوام کے پاس زندگی میں اتنی فرصت بھی تھی کہ وہ شعراء کا کلام سن کر اس پر سردھن سکیں۔ اس کی داد دے سکیں چنانچہ اردو شاعری کا آغاز بھی داستانوں کے

منظوم بیان سے ہوا۔ انسان فطرتاً محیر العقول بیانات، انسان سے مختلف مخلوق کی خیالی داستانوں اور حیرت انگیز کہانیوں اور قصوں سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ چنانچہ اردو شاعری میں بھی ایسی ہی حیران کن کہانیوں کا وجود سب سے پہلے ملتا ہے۔ جنوں اور پریوں کی کہانیاں، جادو کے زور پر ان کے عقل حیران کرنے والے کارنامے، اردو شاعری میں بھی طویل نظموں کی شکل میں ملتے ہیں جسے مثنوی کہتے ہیں۔ چنانچہ اردو شاعری میں طویل مثنویاں اسی قسم کی داستانیوں پر مشتمل ہیں۔

طویل حیرت انگیز داستانوں کے بعد جو انسان کو ایک ایسی تخیلی اور تصوراتی دنیا میں پہنچا دیتی تھی جہاں پہنچنے کی آرزو اس کے دل میں تو ہوتی تھی لیکن وہ ایسی مثالی دنیا میں صرف تخیل کے پروں سے پرواز کرکے ہی پہنچ سکتا تھا۔

دوسرا پرکشش انسانی جذبہ جنسی کشش ہوتا ہے۔ ہر جنس کے لیے مخالف جنس پرکشش ہوتی ہے۔ جس کو بنیادی جبلت یعنی Basic Instinct کہا جاتا ہے۔ جنسی کشش اور صنف مخالف کی محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جو قدرت نے ہر جاندار مخلوق کو عطا کیا ہے تاکہ افزائش نسل کا سلسلہ جاری رہ سکے اور خداوند تعالیٰ کی یہ کائنات آباد رہے۔ اسی جبلت کی عکاسی مثنویوں میں بھی نظر آتی ہے جن میں جنوں، پریوں، جادو کے کارناموں کے ساتھ محبت کے جذبے بھی نظر آتے ہیں۔ صنف مخالف کے حسن کا بیان بھی ملتا ہے بلکہ محبوب کے حسن سراپا کا بیان ان طویل نظموں میں شامل نظر آتا ہے۔ حسن اور عشق کے اس موضوع نے فارسی اور اردو شاعری میں ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت اختیار کرلی جسے غزل کا نام دیا گیا ہے۔ غزل کے لغوی معنی ''عورتوں سے حسن وعشق کی باتیں کرنا'' ہیں جب کہ ایک محقق نے لفظ غزل کو غزال سے اخذ کردہ قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے غزل یا ہرنی شکاری سے بچنے کے لیے دوڑتی ہے۔ شکاری اس کا پیچھا کرتا ہے اور اسی پر تیر چلاتا ہے۔ ہرنی زخمی ہوکر دوڑنے سے معذور ہوجاتی ہے اور گر پڑتی ہے۔ جب شکاری اس ہرنی کے قریب پہنچتا ہے تو شکاری کو ہرنی کی آنکھوں میں جس بے بسی اور لاچاری کی کیفیت نظر آتی ہے اسی کیفیت کا نام غزل ہے۔ چنانچہ غزل میں بھی ابتدائی دور میں معشوق ہمیشہ جفا پیشہ، ظالم، ستم گر، بے وفا یا ہرجائی نظر آتا ہے جبکہ عاشق یا شاعر اس پر اتنا فریفتہ ہوتا ہے کہ اس کے تمام تر ظلم وستم اور جفاؤں کو برداشت کرنے کے بعد بھی اسی کا دم بھرتا نظر آتا ہے۔

بعد میں غزل کا دامن بے حد وسیع ہوگیا۔ اسی میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں بھی شامل ہوگیا بلکہ ترقی پسند شعراء کے دور میں تو غم دوراں کو غم جاناں پر فوقیت دی گئی چنانچہ فیض کہتے ہیں:

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

یا پھر

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

لیکن اس کے باوجود غزل پر حسن وعشق ہی غالب رہا۔ چنانچہ یہی فیض اعتراف کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ

کرر ہا تھا غمِ جہاں کا حساب
رات یاد بے حساب آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری

دل میں یوں روز انقلاب آئے

یا پھر

کوئی انقلاب زمانہ بھی نہ مزاج حسن بدل سکا
نہ حسین جبیں کی شکل گئی نہ سیاہ زلفوں کے خم گئے

مثنوی اور غزل کے علاوہ اردو شاعری میں دیگر کئی اصناف سخن موجود ہیں۔ جیسے قطعہ، رباعی اور جدید شاعری میں ہائیکو، ترائیلے، آزاد نظم، نثری نظم وغیرہ وغیرہ اور ہر ایک کے موضوعات بھی مختلف ہیں۔ لیکن انسان کا فطری جذبہ یا جبلت کا غلبہ بہر حال برقرار رہا۔ الغرض اردو شاعری اور ادب اپنی ابتداء سے آج تک کئی انقلابات سے گذری۔ کئی تحریکیں ابھریں، بام عروج تک پہنچیں اور دم توڑ گئیں جیسے رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات وغیرہ وغیرہ لیکن حسن اور عشق کا جذبہ ان تمام تحریکوں پر بھی چھایا رہا اور کوئی بھی تحریک جس کا بنیادی مقصد کچھ بھی رہا ہو۔ حسن وعشق کے بیان سے اپنا دامن نہ بچا سکی، کیونکہ یہ قدرتی انعام اور فطری تقاضہ ہے۔

قلم کاروں سے

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں اشاعت کے لیے معیاری اور تصحیح شدہ مضامین، نظمیں اور دیگر تحریریں ان پیج فائل میں ارسال کریں۔ غیر معیاری، غیر اصلاح شدہ اور کمپوزنگ کی بے شمار غلطیوں والے مضامین، نظمیں و دیگر تحریریں ہم شائع کرنے سے معذور رہیں گے۔

(مدیر)

جہانگیر قیاس۔ حیدرآباد

غزل

اپنی نیکی کو نہ غارت کرتا
گر نہ تشہیر سخاوت کرتا

گر نہ نفرت کی سیاست کرتا
وہ دلوں پر بھی حکومت کرتا

جو ملا اُس پہ قناعت کرتا
پھر نہ غربت کی شکایت کرتا

جو دعائیں تری مقبول نہیں
کاش تو دل سے عبادت کرتا

برکتیں آتیں ترے گھر میں بھی
گر تو مہماں کی ضیافت کرتا

در بدر کا نہیں ہوتا ہرگز
گر وراثت کی حفاظت کرتا

یوں نہیں ہوتا و مظلوم قیاسؔ
متحد اپنی جو طاقت کرتا

عبدالحفیظ رحمانی ۔ایم۔اے۔ایم۔فل پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالرعثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

صحافت کے اصول وصحافتی اخلاقیات

صحافت کے اصول صحافیوں کے لئے ضابطہ اخلاق 1920ء سے ہی تشکیل پانے شروع ہوئے۔آج پوری دنیا کے ساٹھ سے زائد ممالک ان ضوابط کی پیروی کررہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اخلاقیات اوران کا دائرہ عمل ہرجگہ یکساں نہیں ہوتا۔جیسا کہ کہا جاتا ہے One's meat is another's poision۔جو باتیں کچھ ممالک میں مخرب اخلاق ہیں، دوسرے ممالک میں انھیں معاشرہ کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ کچھ ممالک میں صحافیوں نے ضوابط از خود مدون کئے ہیں۔انھیں صحافیوں کی پیشہ ورانہ تنظیمیں نافذ کرتی ہیں۔ کچھ ممالک اپنے طور پر مرتب کردہ ضوابط نافذ کرتے ہیں۔کمیونسٹ بلاک کی حکومتیں خود کے بنائے ہوئے اصول وضوابط نافذ کرتی ہیں۔مغربی ممالک بالعموم معلومات کی آزادی،صداقت اور غیر جانبداری کی حمایت کرتی نظر آتی ہیں،لیکن میڈیا میں ذمہ دارانہ اورآزادانہ کام کے مواقع نظر نہیں آتے۔

صحافتی ضوابط کے تحت عموماً درج ذیل تصورات مروج ہیں:

1۔ معلومات کی آزادی کا تحفظ

2۔ معلومات کے ذرائع تک رسائی کی آزادی

3۔ معروضیت، درستی، صداقت یا حقائق کو جوں کا توں پیش کرنا

4۔ عوام،اس کے حقوق اور مفاد کے تئیں ذمہ داری

5۔ تہمت طرازی، بے بنیاد الزام تراشی اور نجی زندگی میں دخل سے اجتناب

6۔ اخلاقی بلندی،ایمانداری اورآزادی

7۔ جواب دینے اورتصحیح کرنے کا حق

8۔ پیشہ ورانہ آزادی کا احترام

9۔ انفرادی ملکوں کی ثقافت،وسماجی ضوابط کا پاس ولحاظ

10۔ مذہبی معاملات میں نقد وتبصرہ سے احتراز

میک برائڈ رپورٹ میں صحافیوں کے تئیں ذمہ داریوں سے بحث کی گئی ہے۔یہ ذمہ داریاں عوام کے تئیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ان میں سے کچھ یہ ہیں :

1۔ میڈیا اوراپنی اندرونی تنظیم کے تعلق سے صحافیوں کی معاہداتی ذمہ داریاں

2۔ رائے عامہ اور بہ حیثیت مجموعی معاشرے کے تئیں ان کے ناگزیر فرائض

3۔ قانون کی تعمیل کے ضمن میں فرائض جواب دہی

4۔ انسانی اقدار کا احترام۔اس تعلق سے بین الاقوامی برداری کے تئیں ذمہ داریاں

بہرحال پیشہ وارانہ اخلاقیات کا دائرہ قانونی ضوابط سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔آزادی اور ذمہ داری کے درمیان صحیح توازن کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے اس کی دو فروعی قسم بندیاں (dichotomy) کی جاتی ہیں۔اخلاقی پہلوؤں کا انحصار نہ صرف صحافی کے شعوری فیصلے پر ہوتا ہے بلکہ میڈیا میں اور عام سماجی ماحول میں پائی جانے والی روایتوں پر ہوتا ہے۔

میک برائڈ رپورٹ میں حسب ذیل صحافتی

اخلاقیات اور ضوابط کی سفارش کی گئی ہے:

1۔ قارئین، سامعین، ناظرین یا عمومی طور پر عوام کے مفادات کا تحفظ

2۔ زیر ملازمت صحافیوں اور ان سے وابستہ تمام اہل فن کو تحفظ فراہم کرنا اور انھیں ترغیب دینا

3۔ جو کچھ شائع ہو، اس کی مکمل قانونی اور اخلاقی ذمہ داری لینے والے مدیروں یا دیگر لوگوں کی رہنمائی کرنا۔

4۔ مالکین، حصہ داران اور حکومتوں کی ذمہ داریاں طے کرنا۔

5۔ مشتہرین اور ان لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرنا جو میڈیا کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

ہندوستان میں صحافیوں کے لئے اخلاقیات کے ضوابط تیار کرنے کی کوششیں اب تک ناکام رہی ہیں۔ نہ تو پریس کونسل نے اور نہ ہی کل ہند مدیران کانفرنس نے صحافت کے پیشے سے وابستہ بھی لوگوں کے لئے قابل قبول ضوابط تیار کئے ہیں۔

1966ء میں پریس کونسل نے دس ہزار سے زائد اخباروں اور مجلوں کو ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے سوال نامہ جاری کیا تھا، لیکن باز رسانی بہت حوصلہ افزا نہیں رہی۔ 1976ء میں مدیران کی ایک کمیٹی نے اخلاقیات کو پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ پریس ایک ایسے سیاق و سباق میں واقعات کی سچی، مکمل اور قابل اعتماد روداد پیش کرے جو معاشرے کے تشکیلی گروپ کی نمائندہ تصویر پیش کرنے کا اہل ہو۔ علاوہ ازیں پریس اپنے آپ کو تنقید و تبصرے کا فورم تصور کرے اور معاشرے کے اغراض و مقاصد اور اس کی قدروں کو واضح طریقے سے پیش کر کے اپنی سماجی ذمہ داری انجام دیں۔

بہرحال پریس کونسل آف انڈیا حالیہ برسوں میں کافی طاقتور تنظیم ثابت ہوئی ہے۔ عوام اور میڈیا میں اسے کافی قبولیت ملی ہے اور اسے ادب و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

نئی پریس کونسل نے مدیروں اور صحافیوں سے پوچھا کہ آیا صحافتی کوڈ ضروری ہے۔ یہ اتفاق رائے سامنے آ رہی ہے کہ پریس اپنے آپ کو چلائے گا اور اس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ البتہ جہاں پریس ذاتی زندگی میں مداخلت کرتا ہے یا فرقہ وارانہ عصبیت کو فروغ دیتا ہے تو ایسی صورت میں پریس کونسل کو حدود میں رکھنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ پریس کونسل کے مشورہ پر حکومت کی طرف سے اشتہارات کا بند کرنا اور سرکاری منظوری یا تسلیم شدہ حیثیت کو واپس لینا ہے۔

پیدائشی طور پر تو انسان نہایت سیدھا سادا ہوتا ہے۔ کوئی فطری صحافی نہیں ہوسکتا۔ باضابطہ تعلیم و تربیت اور جد و جہد کے ذریعہ انسان باکمال صحافی بن سکتا ہے۔ اب تو صحافت باقاعدہ اعلیٰ تعلیم کا ایک شعبہ بن چکی ہے۔ صحافت کسی ایک فن یا موضوع سے نہیں کرتی بلکہ اس کا تعلق ہر اس شعبہ سے ہے جس کا تعلق انسانی زندگی اور ضروریات سے ہو۔ سیاست، تاریخ، سیرت، ادبیات، معاشیات، اقتصادیات، تجارت، طب، سائنس، کھیل کود، فلم اور دیگر علوم و فنون بھی شامل ہیں۔

صحافی یا رپورٹر میں حسب ذیل صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے:

1۔ صحافی کے اندر عقاب کی سی بلندی ہونی چاہئے۔ اس کے اندر تجسس اور اخذ کرنے کی صلاحیت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہو، تاکہ بروقت تازہ اور اہم خبریں حاصل کر سکے۔

2۔ نامہ نگار کے اندر غور و فکر اور تدبر و تفکر کا مادہ ہو۔ وہ مذہب اور ذات پات کی حدود و قیود سے بلند رہے۔ ہر ایک سے خوشگوار تعلقات استوار رکھے۔ صرف انسانیت کی خدمت اس کے پیش نظر رہے۔

3۔ ایک صحافی کو باسلیقہ ہونا چاہئے۔ اس کے اندر

سنجیدگی، سلیقہ، تہذیب، شرافت اور نظامت کا جوہر ہو۔

4۔ صحافی کو باحوصلہ اور باہمت ہونا چاہئے۔ جنگ کے حالات میں، جبکہ جان کو بہت کچھ خطرہ ہوسکتا ہے، صحافی کو ہمت وحوصلہ اور جواں مردی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح قدرتی آفات اور سیلاب میں صحافی موج وتلاطم کی پرواہ کئے بغیر دور دراز علاقوں تک پہنچ کرر پورٹنگ کرتا ہے اور حالات سے عوام کو واقف کراتا ہے۔

5۔ رپورٹر کا مستقل مزاج ہونا بھی بیحد ضروری ہے۔ قوت برداشت اور تحمل مزاجی اور ہر کام کو استقلال سے نبھانے کا عادی ہونا چاہئے۔

6۔ صحافت میں حق گوئی اور راست بازی کو بڑا مقام ہے۔ جو خبر جیسی ہو، اسے اسی انداز میں بلا کم وکاست شائع کرے۔ اگر خبر کہیں سے مستعار لی گئی ہو تو برملا اس کا اعتراف کرے۔ اگر سہواً کوئی بات غلط چھپ گئی ہو تو دوسرے ہی دن قارئین سے معذرت کر لی جائے۔ ایسی باتوں سے احتراز کیا جائے جن سے معاشرہ پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہوں۔

7۔ علمی صلاحیت کے بغیر صحافی حقیقی کامیابی اور ترقی نہیں کرسکتا۔ نامہ نگار کو اتنی معلومات ہونی چاہئے کہ کسی لیڈر کی گفتگو یا تقریر سن کر اس کے صحیح وغلط ہونے کا فیصلہ کرسکے۔ چارلس اے۔ ڈانا کے بقول "نامہ نگار ہر فن میں طاق ہو۔ اور اس میں یہ معلوم کرنے کی امتیازی وقت ہو کہ دلیل قانونی ہے یا نہیں۔ صحافت ایسا شعبہ ہے جس میں ہر علم کی ضرورت پڑتی ہے۔

8۔ صحافی کے اندر خبر سونگھنے کی چیونٹی جیسی قوت شامہ ہونی چاہئے۔ اسے اس بات کا اندازہ ہونا چاہئے کہ یہ خبر ہے یا نہیں ہے۔

(مصادر: صحافت کے اصول، از: پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد؛ رہنمائے صحافت از نور السلام ندوی)

استاذ الاساتذہ حضرت **عبدالرحمن جامی**ؒ۔ حیدرآباد

غزل

ابھی لوٹا ہے مسافر ابھی دَر کھولے گا
کچھ تھکن اترے تو سامانِ سفر کھولے گا

دل وہ سہما پرندہ ہے کہ ہر آہٹ پر
شاخِ احساس پہ پھر آس کے پَر کھولے گا

عمر لگ جائے گی تسلیم کرانے میں اُسے
کون اُس شوخ سے اب بحث کا در کھولے گا

تجھ سے بس اتنی گزارش ہے کہ مت یاد دِلا
واقعہ درد کا پھر زخمِ جگر کھولے گا

آگ لگ جائے گی تجسیم کی چنگاری سے
وہ جو شعلہ ہے تو دامانِ شرر کھولے گا

وہ پڑھے تو سہی اِک بار صحیفہ دل کا
پھر اُسے آپ ہی وہ شام وسحر کھولے گا

ہوتا جائے گا ترے دل پہ مرے غم کا اثر
جیسے جیسے ترا دل بابِ اثر کھولے گا

کیا پتہ آگہی محسوب ہوتی ہے کتنی
آج سنتے ہیں جنوں کیسۂ زر کھولے گا

اُس پہ کھُل جائے اگر رازِ محبت جامیؔ
مجھ پہ وہ خود کو بہ اندازِ دِگر کھولے گا

وسیم بیگم، پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

انشائیہ اور مقالہ میں فرق

مقالہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں نثر کی بنیاد کسی ایک فکر وخیال یا ایک موضوع پر بحث ہو یا کسی کتاب کا باب یا حصہ ہو۔مقالہ کے معنی فیروزاللغات میں قول ،مقولہ، آرٹیکل، تحریر، اقلدلیس کا ہر حصہ جس میں اقلدلیس کے دعوے ان کے ثبوت اور شکلیں درج ہوں اس کو مقالہ کہتے ہیں۔

مقالہ کے لغوی معنی ہے بات، گفتگو یعنی جو کچھ کہا جائے اصطلاح میں کسی خاص موضوع پر علمی وتحقیقی انداز میں تحریری اظہارِ خیال کو مقالہ کہتے ہیں۔مقالہ کسی بھی موضوع پر تحریر کیا جاسکتا ہے مثلاً سیاسی مقالہ، سماجی مقالہ، علمی مقالہ، ادبی مقالہ، سائنسی مقالہ وغیرہ۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر مقالے کی تعریف یوں بیان کرتی ہیں کہ:

> ''مقالہ عام طور پر اس طویل اور بسیط مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع پر عالمانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالی جائے۔مقالہ اپنی استدلالی صلاحیت اور گہرائی کی وجہ سے ہلکے پھلکے مضامین سے خاصا مختلف ہوتا ہے''۔(اردو مضمون کا ارتقا، ڈاکٹر سیدہ جعفر، صفحہ۔۵۳)

ہندوستان میں اردو زبان میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۵ء کے آس پاس ہوا تھا۔مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوا۔دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق بھی ہوا کرتا تھا اس دور کی مقالہ نگاری کا اندازہ مقالوں کے عنوانات سے ہوجاتا ہے عنوانات اس طرح کے ہوتے تھے'' بالائی (شمالی) ہندوستان پر ریلوں کے جاری ہونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا؟''۔امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۴۹۔۵۰ء کے مقابلہ کے لیے یہ موضوع تجویز کیا گیا تھا۔''اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا؟''

ان اردو اور انگریزی انعامی مقابلوں میں طلائی تمغے دیئے جاتے تھے۔مفتی صدرالدین آزردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لیے ایک طلائی تمغہ عطا کیا تھا۔ان مقابلوں میں انعام پانے والے طلباء میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، نذیر احمد، مولوی احمد ذکاءاللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاء الدین خصوصیت رکھتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر علم حاصل کرنے کے بعد اسی کالج میں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

اس دور کے ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ مقالہ نگاری ترقی پائی۔ماسٹر رام چندر نے فوائد الناظرین اور'' محبِّ ہند'' رسالے جاری کئے۔جس میں علمی وادبی مقالہ بھی شائع ہوتے تھے آخر کار یہ رسائل ۱۸۵۴۔۵۵ء میں بند ہوگئے اس کے علاوہ اس دور کی ادبی

انجمنوں میں بھی مقالہ نگاری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۶ء میں انجمن دہلی سوسائٹی نے بھی خدمت انجام دی۔اس وقت انجمن میں تقریروں کے علاوہ اصلاحی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔اس دور کے اہم مقالہ نگاروں میں ماسٹر پیارے لال کے مقالے پنجاب کے رسالے ''اتالیق'' میں شائع ہوتے تھے۔

مولانا شبلی اس دور کے اہم مقالہ نگار تھے ان کے مقالے آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں۔زندگی اور علم و ادب کے اہم شعبہ پر مقالے لکھے ہیں۔شبلی نے اپنے شگفتہ اسلوب بیان اور متنوع موضوعات سے مقالہ نگاری کو اس دور میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔زبان کی لطافت ورنگینی اور نزاکت وخیال نے اردو نثر کا معیار بلند کر دیا۔شبلی نے تقریباً ایک سو مقالے یادگار چھوڑے ہیں۔مگر ان میں ایک بھی ''ایسے'' نہیں پایا جاتا ہے۔

اس دور کے مقالہ نگاروں میں مہدی حسن خصوصیت رکھتے ہیں ۔ مہدی حسن نے فارمل ایسیز (Formal) مقالے لکھے ہیں۔لیکن ان ادبی مقالوں کو اپنی شوخی بیان سے ''ایسے'' کا Mood دے دیا ہے یہ شگفتہ ہیں۔میر ناصر علی اس دور کے آخری چراغ ہیں۔ان کے مقالے، عرس وسال گرہ، خیال بہ مقالہ، زبان زندگی بھی ایک معرکہ ہے، نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا، چراغ شعبدہ باز، ہر حیثیت سے ایسیز کہلانے کے مستحق ہیں۔ حالی اور سرسید نے بھی کثرت سے مقالے تحریر کیے ہیں۔

اردو ادب میں شاعری کے بعد مقالہ نگاری کو فروغ ہوا۔ادب کے میدان میں سینکڑوں مقالہ نگار سامنے آئے اس دور کے مقالہ نگاروں کو دو گرہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند اہم یہ ہیں پہلے گروہ میں شرر، سجاد انصاری، حسن نظامی، پنڈت برج موہن، کیفی، قاضی عبدالغفار، قاضی اختر جونا گڑھی، سید سلیمان ندوی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش ، اسلم جیراج پوری، وحیدالدین سلیم، سر عبدالقادر، حبیب الرحمٰن شیرانی، حافظ محمود شیرانی ، چکبست ، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظمت اللہ، مرزا عظیم بیگ، ملا رموزی، دیا نارائن نگم، احسن مارہروی، ڈاکٹر عبدالحق، ابوالکلام آزاد، عبدالمجید سالک وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے گروہ سے ہاشمی فریدآبادی ، عبدالماجد دریاآبادی، نیاز فتح پوری ، عبدالمالک آروی، عبدالسلام ندوی، رشید احمد صدیقی وغیرہ تعلق رکھتے ہیں۔اس گروہ کے بزرگوں کی بدولت ادب کے میدان میں آنے والوں کے لئے راہ ہموار ہوئی۔اس دور میں تقریباً ہر شعبۂ ادب و زندگی سے متعلق مقالے لکھے گئے ہیں۔جن میں تحقیقی، علمی ادبی اور تنقیدی مقالوں کی کثرت ہے۔ڈاکٹر عبدالحق، محمود شیرانی، وحیدالدین سلیم ، سید سلیمان ندوی، پنڈت کیفی نے ادبی مقالوں کے علاوہ تحقیقی اور لسانی مقالے لکھ کر مقالہ نگاری میں وسعت پیدا کر دی۔ مسعود حسین رضوی، عبدالماجد، حبیب الرحمٰن شیرانی، چکبست، عبدالمجید سالک، عبدالملک آروی، سر عبدالقادر، عبدالسلام ندوی وغیرہ۔ اپنے تنقیدی مقالوں کے لیے خصوصیت رکھتے ہیں۔چکبست نے اپنے سوانحی مقالوں سے بھی بڑا اضافہ کیا ہے۔ان میں سے چند نے (ادب) تاریخی مقالے بھی لکھے ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی اور مذہبی مقالے اردو میں مایہ ناز سرمایہ ہیں۔نیاز فتح پوری کے سیاسی، مذہبی ،تاریخی، ادبی وتنقیدی مقالے ناقابل فراموش اضافہ ہیں۔مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، پطرس، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے مزاحیہ مقالوں کی

شاخ کو صرف تروتازہ ہی نہیں رکھا بلکہ پہلے کے بہ نسبت اس کا معیار بھی بلند کر دیا۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی ان میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

مقالہ دراصل مضمون ہی کی ایک خاص شکل ہے جس کو Thesis یا Formal Eassay بھی کہا جاتا ہے۔ مقالہ کا موضوع شعروادب، تحقیق وتنقید، ثقافت وتمدن، علم وسائنس، تاریخ وسیاست، مذہب وسماج کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آیئے انشائیہ اور مقالہ میں فرق کو دیکھیے۔

مقالہ میں سنجیدگی۔ علمیت اور دیانت ہوتی ہے۔ انشائیہ کی تحریر میں تازگی اور غیر سنجیدگی ہوتی ہے۔ مقالہ طویل اور بسیط مضمون کو کہتے ہیں۔ انشائیہ مختصر اور جامعیت ہوتا ہے۔ مقالہ کا اسلوب ٹھوس اور بھاری بھرکم انداز بیان ہوتا ہے۔ انشائیہ کا اسلوب بہت سلیس، شگفتہ، نرم ونازک ہوتا ہے۔ مقالہ کا مقصد افادی ہوتا ہے۔ انشائیہ کا مقصد انبساطی ہوتا ہے۔ مقالہ کی تکمیل کے لیے کافی چھان بین اور تحقیق وتدقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ انشائیہ کے لیے تحقیق وتدفین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مقالہ میں چند نکات ہوتے ہیں انشائیہ نکات کا پابند نہیں ہوتا۔ مقالہ ''what'' پر زور دیتا ہے۔ انشائیہ ''How'' کو اہم بتاتا ہے۔ مقالہ میں مقصد کی تبلیغ، خیالات کا تسلسل، منطقی استدلال اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ انشائیہ میں ابتداء سے لے کر اختتام تک ربط قائم رہتا ہے۔ انشائیہ نگار کے ذہن میں موضوع سے متعلق ضمنی خیالات آتے ہیں وہ تحریر کرتا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتا ہے۔ مقالہ کی تحریر ایک سمت لے جاتی ہے جس سے تحریر کا ہر گوشہ منور ہوتا ہے۔ قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انشائیہ کی تحریر کئی نئی سمتوں کا اشارہ کرتی ہے۔ ہر بات اور ہر خیال سے علمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مقالہ نگار ہر بات سنجیدہ طریقے سے سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ عالمانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالتا ہے۔ انشائیہ نگار ہر بات غیر سنجیدہ طریقے سے قاری کے دل ودماغ پر چھا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ جانتا ہے اس سے کہیں زیادہ بتاتا ہے۔ مقالہ نگار علم ودانش، حکمت وفلسفہ سے بات واضح کرتا ہے۔ انشائیہ نگار ہلکے پھلکے انداز میں فکر وفلسفے کے نکات بیان کرتا ہے اور اشاروں اشاروں کے ذریعہ معنی تک پہنچتا ہے۔ مقالہ میں سنجیدگی سے تھکان، اعصابی تناؤ اور ذہنی انجماد کا احساس ہوتا ہے۔ انشائیہ کی تحریر میں لطافت، تازگی، گپ شپ، خوش گفتاری موجود رہتی ہے۔ مقالہ معلومات میں اضافہ دیتا ہے۔ انشائیہ میں تاثرات کا اثر ہوتا ہے۔ مقالہ نگاری کی شخصیت سامنے نہیں آتی۔ انشائیہ نگار کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مقالہ میں پختہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔ انشائیہ میں ناپختہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔ مقالہ میں فلسفیانہ انداز ہوتا ہے۔ انشائیہ میں خیالات بگلشت ہوتی ہے۔

مقالہ نثر پر مشتمل اس تحریر کو کہتے ہیں جس کی بنیاد کسی ایک فکر وخیال یا ایک موضوع پر ہو یا پھر اس میں کوئی خاص نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہو۔ مقالہ میں ہر بات اور ہر پیراگراف کسی مرکزی خیال کے منطقی وضاحت کرتا ہے کہ مقالہ آزادانہ اظہار رائے کا ایسا اسلوب ہے جو زندگی کے حالات، واقعات اور معاشرے کی منظر کشی کرتا ہے اس کے ذریعہ ہر جدید چیز کی خصوصیات وصفات اور اوصاف کا کم وقت کم محنت کے ذریعہ پتہ چلتا ہے چاہے اس کا تعلق سیاست سے ہو یا ادب سے، سماج سے ہو یا نقد سے ہو یا علم سے۔

مقالہ میں واضح زبان و اسلوب ، گہری و فکری دلائل وشواہد اور مثالوں کے ذریعہ بات کو سمجھانے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔موضوع کے اعتبار سے مقالہ کے خصائص وامتیازات کا پتہ چلتا ہے۔جیسے مقالہ، سیاسی، سماجی اور ادبی اقسام پر مشتمل ہو۔ادبی مقالہ میں ادبی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جبکہ علمی مقالہ میں علمی اور تحقیقی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ذاتی مقالہ میں مقالہ نگاری کی شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔کسی بھی مقالہ کا اصل خلاصہ و نتائج ہوا کرتے ہیں جو علمی و منطقی تجزیہ کے بعد دلائل کی روشنی میں سامنے آتے ہیں وہی مقالہ کی اصل فکر کا خلاصہ اور نتیجہ ''بحث'' ہوا کرتے ہیں۔

مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی ،علمیت،متانت اور دیانت ہوتی ہے ۔مقالہ نگار کسی موضوع پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔روشنی براق ہوتا ہے۔ایسی براق کہ نفس تحریر کا ہر گوشہ منور ہوجاتا ہے۔ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں۔اور موضوع تحریر معنی نفس مقالہ سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔

انشائیہ نگار بھی کسی امر پر روشنی ڈالتا ہے، لیکن یہ روشنی یک رنگ نہیں ہوتی ۔یہ صاف شفاف بھی نہیں ہوتی، یہ صبح کا اجالا ہوتی ہے۔ملگجی، کچھ صاف اور کچھ میلی۔یہ روشنی ہماری توجہ کو ایک ہی سمت نہیں لے جاتی۔بلکہ اسے اٹھکیلیاں کراتی ہے۔

ان تمام تقابلی تحریروں سے اس بات کا اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے کہ یہ صنف مقالہ نگاری سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

ادارہ ادب صادق حیدرآباد کی جانب سے ڈاکٹر ناظم علی، محسن خان ریسرچ اسکالر، معروف صحافی نصر اللہ خان کو اعزاز سے نوازا گیا۔ادارہ مبارکباد پیش کرتا ہے۔
تصویر میں معروف شاعر جہانگیر قیاس ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر مظفر علی ساجد ڈائرکٹر زیمر لیس اکیڈمی اور مشہور شاعر ظہور ظہیر آبادی

ماہنامہ صدائے شبلی نومبر ۲۰۲۱ء کا تازہ شمارہ علامہ بونائی حسنی ممبئی سکریٹری آل انڈیا علماء بورڈ دہلی، جناب لطیف صاحب، مولانا مساعد ہلال احیائی
مفتی محمد عمیر صاحب، مولانا انظر امام صاحب مولانا راشد فضل، وغیرہ کے ہاتھوں میں

تصویر میں ڈاکٹر مسدودی کی عظیم خدمات پر ان کو پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر م ق سلیم، ڈاکٹر رووٗف خیر، ڈاکٹر خلیل صدیقی، جناب مسرور عابدی، جناب ایف ایم سلیم، ڈاکٹر افتخار شکیل، جناب عمر قیصر، جناب افتخار عابد، جناب ظہور ظہیر آبادی اور مبین احمد زخم "ملت کا روشن ستارہ" اور "شہنشاہ قلم وادب" ایوارڈ سے نوازتے ہوئے۔ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ ان کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

آل انڈیا علماء بورڈ دہلی کے صدر شاہی امام مولانا نیاز احمد قاسمی دہلی ،علامہ بوتائی حسنی سکریٹری، مولانا شمیم اختر ندوی علماء بورڈ کے کنویشن حیدرآباد میں شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیرمن اور ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی کو اعزاز سے نوازتے ہوئے۔ادارہ آل انڈیا علماء بورڈ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning:9:00 am to 3:00 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلزنز د مسجد نورعلی، شاہین نگر، حیدرآباد
Regd No: 180/2016

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...................گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے
حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ ۔تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵ رجنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ٹرسٹیوں کے مشورے سے ٹرسٹ اور مدرسہ کے لیے تین سوستائیس (327) رگز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جا چکی ہے،جس کی مجموعی قیمت چھتیس لاکھ ستّر ہزار تھی۔الحمدللہ اہل خیر کے تعاون سے بیشتر رقم ادا کردی گئی ہے۔ماشاءاللہ تعمیری کام جاری ہے۔الحمدللہ پہلا چھت پڑ چکا ہے،مزید مراحل کے لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ نقد اور اشیاء سے تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

Bank Name: IDBI CURRENT ACCOUNT
A/c Number: 1327104000065876
A/c Name: SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code: IBKL0001327. Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

Dec. 2021

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216

Rs. 20/-

مجتبیٰ ٹکسٹائلس

MUJTABA
TEXTILES

#20-4-20/6/1, 20-4-20/7/5 & 7/6, Punch Mohalla, New Laad Bazar,
Khilwath, Hyderabad. T.S. India
Ph: +91 6281040896 - Email: mujtabatextiles18@gmail.com - Web: www.mujtabatextiles.com
Follow us on facebook: https://www.facebook.com/mujtaba.textiles.1

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com